وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ وفاق المدارس ملتان

جلد نمبر ۲۰ شمارہ نمبر ۲ صفر المظفر ۱۴۴۴ھ ستمبر ۲۰۲۲ء

بیاد

شمس العلماء
حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ العلماء
حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

محدث العصر
حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

مفکر اسلام
حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ

جامع المعقول والمنقول
حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس المحدثین
حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

استاذ المحدثین
حضرت مولانا عبد الرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ

سرپرست

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

شیخ الحدیث حضرت مولانا انوار الحق حقانی مدظلہم
سینئر نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر اعلیٰ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم
ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر

مولانا محمد احمد حافظ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

وفاق المدارس العربیہ پاکستان گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

فون نمبر 061-6514525-6514526-27 فیکس نمبر 061-6539485
Email:wifaqulmadaris@gmial.com web:www.wifaqulmadaris.org

ناشر: حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری ● مطبع: اقرأ التحریر پرنٹنگ پریس پرانی غلہ منڈی دہلی گیٹ ملتان
شائع کردہ مرکزی دفتر وفاق المدارس العربیہ گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

وفاق المدارس العربیہ پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

سیلاب کی تباہ کاریاں	کلمۃ المدیر	۳
موجودہ معاشی بحران	حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ	۷
علوم الحدیث کا اجمالی تعارف	مولانا مفتی محمد طارق	۱۳
گناہ اور معصیت! آفات کا سبب	مولانا شفیق الرحمٰن علوی	۲۳
دعا ایک نادیدہ خزانہ ہے	مولانا محمد ابرار کلیم القاسمی	۳۲
سوشل میڈیا اور ہمارا طرزِ عمل	مولانا مفتی شمس الدین	۳۷
کتب ادب وانشا کا طریقہ تدریس	مولانا محمد اجمل قاسمی	۴۲
تحریک استشراق اور ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی	محمد احمد حافظ	۵۳
امام القراء حضرت مولانا قاری محمد علی مدنی نور اللہ مرقدہ	حسن خلیل مدنی	۵۹
تبصرہ کتب	محمد احمد حافظ	۶۲

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر- سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر- ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر-

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: 40 روپے، زر سالانہ مع ڈاک خرچ: 500 روپے

سیلاب کی تباہ کاریاں

اور ہمارے لیے غور وفکر کا موقع

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

تمام تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا خالق و مالک ہے، جس کے قبضہ قدرت میں تمام طاقتیں ہیں، جو رؤف ورحیم وکریم بھی ہے اور جبار وقہار بھی ہے۔ درود وسلام ہو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے اصحاب وآل پر.....آمین!

گزشتہ دو ماہ تقریباً پورے ملک میں شدید بارشوں کے باعث سیلابی صورت حال رہی۔ گوادر سے گلگت اور بدین سے بلتستان تک اکثر مقامات میں طوفانی بارشیں ہوئیں، جس کے نتیجے میں سیلابی ریلوں نے تباہی مچائی ،سینکڑوں لوگ پانی میں ڈوب کر جاں بحق ہوئے ،بستیوں کی بستیاں ملیامیٹ ہوئیں، کئی مقامات پر مسجدیں اور مدارس بھی سیلاب کی زد میں آکر زمین بوس ہوئے ہیں۔ کسانوں کی فصلیں اور باغات تباہ ہوئے۔ املاک واموال کے نقصان کے ساتھ ساتھ مویشی بھی سیلابی ریلوں کی نذر ہوئے۔ لاکھوں لوگ سیلاب کی وجہ سے گھروں کو چھوڑ کر نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ بلوچستان اور جنوبی پنجاب سب سے زیادہ سیلابی ریلوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ بلوچستان میں تو کئی مقامات پر بند اور ڈیم ٹوٹنے سے زیادہ تباہی ہوئی ہے۔ غیر معمولی بارشوں کے نتیجے میں ہونے والی تباہی سے خیال کیا جارہا ہے کہ قوم کو قحط اور غذائی قلت کا سامنا ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال رحم فرمائے.....آمین!

بے حسی کہیے.....کہ عین ایسے وقت جب وطن عزیز کا ایک بڑا علاقہ بے رحم سیلابی موجوں کی زد میں تھا، لوگ سیلاب سے بچنے کے لیے اپنے بھرے پُرے گھر چھوڑ کر نقل مکانی پر مجبور ہورہے تھے؛ ہمارے حکمران جشن آزادی کے نام پر رقص وسرود کی مجلسیں جمائے بیٹھے تھے۔ میڈیا نے بھی بے حسی دکھائی، اور سیاسی بکھیڑوں کو مزید اُلجھانے میں مصروف رہا۔ سیاسی جماعتوں کے لیے تو یہ کوئی خاص وقوعہ ہی نہ تھا۔ بس دینی ذہن رکھنے والے مخیّر حضرات؛ دینی مدارس.....جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی، دارالعلوم کراچی، جامعہ خیر المدارس ملتان، بیت السلام ٹرسٹ، الفاروقیہ ٹرسٹ، الحرمین ٹرسٹ، الخیر ٹرسٹ یا انصار الاسلام اور دیگر بہت سی تنظیموں کے کارکنان اپنی بساط کے مطابق امدادی کام انجام دیتے ہوئے نظر آئے۔ وفاق المدارس العربیہ کے صدر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم نے نہ صرف سیلاب زدگان کے لیے سو گھر تعمیر کرکے دینے کا اعلان کیا بلکہ جامعہ دارالعلوم کی جانب سے سیلاب زدگان کی امداد کا

الگ شعبہ بھی قائم کیا۔اس موقع پر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم نے اپیل کی کہ اہل مدارس بے گھر ہونے والے سیلاب زدگان کے لیے اپنے مدارس کے دروازے کھول دیں،اور جس قدر ممکن ہو سیلاب متاثرین کی مدد کریں۔

مجموعی طور پر سیلاب زدگان کی امداد کے لیے دینی طبقہ ہی آگے رہا۔لوگوں نے بھی دل کھول کر تعاون کیا۔بنیادی طور پر یہ اس طرح کے امدادی امور ریاست وحکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف آگے بڑھ کر خود آفت زدگان کی مدد کرے بلکہ پوری قوم کو اس حوالے سے متحرک کرے،مگر ایسا کچھ نہیں ہو سکا،حکومت اور ذرائع ابلاغ کی سطح پر بے توجہی اور بے اعتنائی کی کیفیت طاری رہی۔اب اگرچہ سیلابوں کا سلسلہ تھم چکا ہے لیکن جن لوگوں کے گھر بار تباہ اور جمع پونجی ختم ہو چکی ہے،اور ان کے بہت سے عزیز طوفانی موجوں کی زد میں آکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکے ہیں،انہیں آج بھی نصرت اور تعاون کی ضرورت ہے۔ان کے سنبھلنے اور دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں وقت لگے گا۔اس درد وغم کو مل کر ہی بانٹا جا سکتا ہے۔صاحب حیثیت افراد اور رفاہی تنظیموں کو بھرپور انداز میں آگے بڑھ کر دست تعاون دراز کرنا چاہیے۔مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کی جائے،ان کی بحالی اور انہیں دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔یہ ہمارا دینی،اخلاقی اور قومی فریضہ ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔جس طرح کی تباہی آئی ہے اس سے نکلنے میں کئی ماہ لگ سکتے ہیں۔اس لیے غیر معمولی محنت اور قربانی کی ضرورت ہے۔

☆.....☆

یہ باتیں تو ظاہری اسباب کے درجے کی ہیں اور انسان وہی کچھ کر سکتا ہے جو اس سے بن پڑے۔آفات وبلیات سے حفاظت تو دراصل اللہ وحدہ لاشریک ہی فرما سکتے ہیں۔ہمارا عقیدہ وایمان ہے کہ کائنات کا کوئی ایک ذرّہ بھی اَللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر حرکت میں نہیں آ سکتا۔یہ بادل،ہوا،پانی،جمادات ونباتات .....سب اللہ رب العالمین کے حکم کے تابع ہیں۔حد سے بڑھی ہوئی گرمی یا سردی،آندھی یا طوفانی بارشیں اور سیلاب اللہ تعالیٰ کے حکم کے ہی تابع ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی ان سے حفاظت فرما سکتے ہیں۔انسان جس قدر بھی مادی اسباب اختیار کرے بالآخر اپنے پروردگار کی قوت وجبروت کے آگے جھکے بغیر چارہ نہیں۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ قدرتی آفات،زلزلے،خشک سالی،شدید بارشیں اور تباہ کن سیلاب اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی علامات ہیں۔جس بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی ہے اسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کی صورت تھی۔من حیث المجموع ہمارے اندر وہ تمام احوال وعوامل موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی

کا سبب بنتے ہیں۔ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے متمتع ہوکر بھی اس کی نافرمانیوں میں حد سے بڑھ جاتی ہے، آخرت کے انجام کو فراموش کر دیتی ہے، تو پھر اس طرح کے چھوٹے چھوٹے عذاب دے کر اسے تنبیہ کی جاتی ہے؛ تاکہ لوگ سنبھل جائیں اور اپنے پروردگار کی اطاعت وفرماں برداری بجالائیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے

اَوَلَایَرَوْنَ اَنَّھُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّۃً اَوْمَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَایَتُوْبُوْنَ وَلَاھُمْ یَذَّکَّرُوْن (التوبہ)

''کیا لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اس پر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ کوئی سبق لیتے ہیں۔''

دنیوی زندگی میں آزمائش کی چند متعین صورتیں نہیں ہیں، بلکہ کبھی عقلوں کو مسخ کر دیا جاتا ہے اور قومیں صحیح وسقیم میں امتیاز سے عاری ہوجاتی ہیں، ان کے بہترین دماغ درست فیصلے کرنے سے عاجز ہوجاتے ہیں۔ کبھی معیشت تنگ کردی جاتی ہے، اور لوگ روزگار کی خرابی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ قرآن مجید میں قوم نوح، عاد وثمود اور بنی اسرائیل کے قصص وواقعات کو پڑھیے، یہ محض بیان واقعہ کے لیے نہیں ہیں بلکہ عبرت وموعظت اور حصول سبق کے لیے ہیں.....لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِھِمْ عِبْرَۃٌ لِّاُولِی الْاَلْبَاب

''بے شک ان کے قصوں میں سمجھ داروں کے لیے عبرت ہے'' (یوسف، ۱۱۱)۔

ایسے گناہ جو عذاب کا سبب بنتے ہیں؟ اس کی تفصیل بھی احادیث میں ہمیں ملتی ہے؛ ترمذی شریف میں معروف حدیث ہے حضرت علی اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جب غنیمت کے مال کو ہاتھوں ہاتھ لوٹا جانے لگے، امانت کو غنیمت کا مال سمجھ لیا جائے، زکوٰۃ کو تاوان اور بوجھ سمجھا جانے لگے، تعلیم حاصل کرنے میں دین کے مقصد کو پس پشت ڈال دیا جائے، خاوند اپنی بیوی کا فرمانبردار ہوجائے، بیٹا اپنی ماں کا نافرمان ہو، بیٹا اپنے دوست کو قریب رکھے اور باپ کو خود سے دور کرے، مسجدوں میں شور وغل ہونے لگے، قبیلے کا سردار اس کا فاسق شخص ہو، قوم کا لیڈر اس کا رذیل ترین شخص ہو، کسی شخص کی عزت صرف اس کے شر سے بچنے کے لیے کی جائے، ناچنے والیاں اور گانے بجانے کے آلات عام ہوجائیں، شرابیں پی جانے لگیں، اور امت کے بعد والے لوگ پہلے والوں پر لعن طعن کرنے لگیں، تو پھر خدا کے عذاب کا انتظار کرو جو سرخ آندھی، زلزلوں، زمین میں دھنسائے جانے، شکلوں کے مسخ ہونے، پتھر برسنے، اور ایسی دیگر نشانیوں کی صورت میں لگاتار ظاہر ہوگا کہ جیسے ہار کی ڈوری ٹوٹ جائے اور موتی لگاتار گرنے لگیں۔''

یہ حدیث آئینہ ہے، اور ہم اس میں غور وفکر کرکے اپنے اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں، ہمارے انفرادی اور اجتماعی

احوال یقینی طور پر دِگرگوں ہیں،اس میں عامی اور عالم سب شامل ہیں۔ہمیں ضرورت ہے کہ اپنے آپ کا جائزہ لیا جائے اور جہاں کہیں کوتاہی ہے توبہ واستغفار کے ساتھ اس کوتاہی کو دور کیا جائے۔

قرآن مجید زور دے کر کہتا ہے:

وَتُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعاً اَیُّھَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْن (النور)

''اورتم سب اللہ کے حضور توبہ کرو اے مومنو! تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

اللہ تعالیٰ چاہیں تو چشم زدن میں اپنے تمام نافرمانوں کو ہلاک کردیں،مگر ایسا نہیں ہوتا،بعض کو بعض کے لیے عبرت بنادیتے ہیں تاکہ لوگ سرکشی چھوڑ کر اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آئیں،وہ مان لیں کہ اللہ تعالیٰ کی قوت وطاقت بے پناہ ہے.....اِنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعاً،ساری قوتیں اللہ کے لیے ہیں۔چناں چہ فَاسْتَغْفِرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ کی روش اپناتے ہوئے اس کی بارگاہ میں خوب توبہ واستغفار کریں۔یہی صورت ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل کی مستحق ٹھہرا سکتی ہے.....وماعلینا الا البلاغ!۔

حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم کے لیے ستارہ امتیاز کا اعلان

۱۴/اگست یوم آزادی کے موقع پر ملک کی معروف شخصیات کے لیے ستارہ امتیاز کا اعلان کیا جاتا ہے۔اس مرتبہ ان شخصیات میں حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم نام بھی شامل کیا گیا ہے۔گزشتہ برس شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کو بھی ستارہ امتیاز سے نوازا گیا تھا۔طبقہ علماء میں سب سے پہلے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے پہلے صدر حضرت مولانا شمس الحق افغانی نوراللہ مرقدہ کو ستارہ امتیاز دیا گیا تھا۔

ستارہ امتیاز پاکستان میں سول اور عسکری شخصیات کو عطا کیا جانے والا تیسرا بڑا اعزاز ہے۔سول شخصیات کو یہ اعزاز تعلیم،ادب،طب،سائنس،فنون لطیفہ یا کھیل کے میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا ہے۔ اس اعزاز کا اعلان ۱۴/اگست یوم آزادی کے موقع پر کیا جاتا ہے؛اور ۲۳/مارچ یوم پاکستان کے موقع پر صدر پاکستان اس اعزاز سے نوازتے ہیں۔اس مرتبہ قائد وفاق حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم کے نام کا بھی اعلان کیا گیا جو یقیناً خوش آئند ہے۔حضرت ناظم اعلیٰ صاحب مدظلہم کی خدمات کا دائرہ محض تعلیم تک محدود نہیں بلکہ آپ کی خدمات ہمہ جہت اور متنوع ہیں۔آپ کو ستارہ امتیاز دیا جانا وفاق المدارس العربیہ کے لیے خصوصاً اور طبقہ علماء کے لیے بھی اعزاز کی علامت ہے۔زندہ قومیں اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں اور کبھی بھولتی نہیں۔ ہم ان سطور کے ذریعے حضرت ناظم اعلیٰ صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ان کے لیے دست بدعا ہیں۔

موجودہ معاشی بحران

اوراُس کے رفع کرنے کی تدابیر،اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

(آخری حصہ)

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

ذیل میں محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی حکیمانہ اسلوب پر مبنی ایک تحریر پیش کی جارہی ہے۔ان دنوں ہمارا معاشرہ جس قسم کی معاشی تنگی سے دوچار ہے؛اس کے اسباب وعلل ایک تو ظاہر بیں نگاہ دیکھتی ہے اور ایک اصل حقیقت ہے،جس سے حضرت شیخ بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے پردہ اٹھایا ہے۔یہ اپنے موضوع پر جامع تحریر ہے،اگرچہ تحریر قدیم ہے مگر اس کے مندرجات آج بھی تازہ ہیں،اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے.....آمین!

(گزشتہ سے پیوستہ)۱۵-حرب ودفاع ورفاہِ عامہ

قرآن حکیم سامانِ حرب ودفاع وغیرہ پر اموال خرچ نہ کرنے کو اپنے ہاتھوں اپنی موت بلانے کے مرادف قرار دیتا ہے،ارشاد ہے:

"وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ"۔ (البقرۃ:۱۹۵)

ترجمہ:..."اوراللہ کی راہ میں (لڑائی میں) خرچ کرواوراپنی جانوں کواپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت ڈالو"۔

۱۶-سائل،۱۷-غیرسائل

قرآن کریم انسان کے مال میں سائل وغیرسائل ہردوکاحق تجویز کرتا ہے:

"وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ"۔(الذاریات:۱۹)

ترجمہ:..."اور ان (اللہ سے ڈرنے والوں) کے اموال میں حصہ ہے: مانگنے والے اور نہ مانگنے والے (ضرورت مندوں) کا"۔

نیز مانگنے والے باحمیت ضرورت مند کو مانگنے والے پر ترجیح دیتا ہے اور اربابِ اموال کو ایسے غیور ضرورت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کی ترغیب دیتا ہے،ارشاد ہے:

"لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لاَ یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْباً فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمَاهُمْ لاَ یَسْاَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافاً"۔(البقرۃ:۲۷۳)

ترجمہ:..."(وہ صدقات وخیرات) ان ضرورت مندوں کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے ہیں

(اپنی زندگی اللہ کے لیے وقف کردی ہے، اس لیے) وہ زمین میں (کاروبار کے لیے) سفر نہیں کرسکتے، نادان آدمی ان کو غنی سمجھتا ہے، تم ان کے چہروں سے ان کو پہچان لوگے (کہ یہ ضرورت مند ہیں) وہ نہ سوال کرتے ہیں، نہ اصرار''۔

بہرصورت سائل کو جھڑکنے سے سختی کے ساتھ منع فرماتا ہے، بلکہ حکم دیتا ہے کہ اگر اللہ نے تم کو وسعت دی ہے تو اس کی ضرورت پوری کرکے شکر نعمت ادا کرو، ورنہ نرمی سے معذرت کردو، ارشاد ہے:

۱:... ''وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ وَاَمَّا بِنِعْمَتِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ''۔ (الضحیٰ:۱۰،۱۱)

ترجمہ:... ''مانگنے والے کو مت جھڑکو اور اپنے پروردگار کی نعمت کا اظہار کرو''۔

۲:... ''قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ''۔ (البقرۃ:۲۶۳)

ترجمہ:... ''بھلی بات کہہ دینا اور (سائل کی ترش کلامی کو) معاف کردینا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد ایذا رسانی ہو''۔

یہ انفاق کچھ مالداروں اور دولت مندوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر مسلمان خواہ خوشحال ہو، خواہ وہ تنگدست اپنی استطاعت کے مطابق اس کا مخاطب ہے، ارشاد ہے:

''اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ''. (آل عمران:۱۳۳،۱۳۴)

ترجمہ:... ''وہ جنت تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کے لیے، جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی میں بھی اور تنگدستی میں بھی اور ضبط کرتے ہیں غصہ کو اور معاف کرتے ہیں لوگوں (کی خطاؤں) کو اور اللہ پسند کرتا ہے نیکوکاروں کو''۔

جو لوگ ان رضا کارانہ طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں پر طعن وتشنیع کرتے ہیں، ان کے متعلق ارشاد ہے:

''اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ''. (التوبۃ:۷۹)

ترجمہ:... ''وہ لوگ جو طعنے دیتے ہیں ان ایمان والوں پر بھی جو دل کھول کر خیرات دیتے ہیں اور ان پر بھی جو نہیں رکھتے مگر اپنی محنت ومشقت (کی کمائی) پس مذاق اُڑاتے ہیں ان کا، اللہ اُن کا مذاق اڑائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

اس انفاق سے صرف وہ تہی دست لوگ مستثنیٰ ہیں، جن کے پاس دینے کے لیے بجز دعاء خیر کے اور کچھ نہ ہو۔

"لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلاَ عَلَى الْمَرْضٰى وَلاَ عَلَى الَّذِيْنَ لاَ يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَّاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَلاَ عَلَى الَّذِيْنَ إِذَا مَا اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لاَ اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَناً اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ". (التوبۃ:۹۱،۹۲)

ترجمہ:... "نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے کچھ گناہ، جبکہ وہ خیر خواہی کریں اللہ اور اس کے رسول کی، نہیں ہے (ایسے) نیکوکاروں پر کوئی (الزام کی) راہ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور نہ ان لوگوں پر (کچھ گناہ) ہے جو تمہارے پاس جب آئے، تاکہ تم ان کو (جہاد کے لیے) سواری دو تو تم نے کہا: میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کوئی سواری نہیں تو وہ آنکھوں سے آنسو بہاتے (اور اپنی محرومی پر روتے) ہوئے واپس چلے گئے اس غم میں کہ ان کے پاس (جہاد میں) خرچ کرنے کو کچھ نہ تھا"۔

واضح ہو کہ مذکورہ بالا ہر دو آیتیں غزوہ تبوک کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، لہٰذا انفاق حرب و دفاع کی مد سے متعلق ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کو اکتنازِ دولت سے محفوظ رکھنے کی اہم ترین انفاق سے متعلق ان چند آیات پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ ان آیات کی روشنی میں اس انفاق کے مصارف و مدات کی تشخیص و تحدید حسب ذیل ہے:

مستقل انفاقات:

اہل خانہ: خود، بیوی، نابالغ یا ضرورت مند اولاد، ضرورت مند ماں باپ، عبید و اماء، موجودہ زمانے میں ان کی جگہ نوکر و خادم۔

اہل کنبہ: ضرورت مند قرابت دار الاقرب فالاقرب کی ترتیب سے، مجبور و معذور قرابت دار۔

اہل محلّہ: ضرورت مند ہمسایہ قریب، ہمسایہ بعید، شریک حرفہ و کسب معاش۔

اہل ملک: یتیم قرابت دار و غیر قرابت دار، مساکین محتاجین خواہ سائل ہوں خواہ غیر سائل، ضرورت مند اہل حرفہ و شرکاء کار۔

قومی و ملکی: مصارفِ حرب و دفاع و رفاہِ عام۔

عارضی انفاقات:

غیر مستطیع مسافر، غیر مستطیع مدیون، خسارہ زدہ (دیوالیہ) تاجر و کاروباری۔

نتیجہء بحث:

مذکورہ بالاتفصیل سے ظاہر ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا دائرہ پوری قومی زندگی کے.....شخصی، عائلی، انفرادی، اجتماعی، قومی وملکی.....مصارف ومدات پر محیط ہے۔ اگر ملک کے اعلیٰ، متوسط اورادنیٰ طبقات خصوصاً دولت مندوں کا فاضل سرمایہ.....جوعفو کا مصداق ہے.....اللہ کے حکم کے مطابق مذکورہ بالا مدات میں برابر خرچ ہوتا ہے تو ملک میں سرمایہ کبھی منجمد ہو ہی نہیں سکتا، خواہ ان دولت مندوں کے پاس سرمایہ کتنی ہی فراوانی کے ساتھ کیوں نہ آتا رہے۔ اسلام دین فطرت ہے، اس لیے قرآن حکیم دولت مندوں اور سرمایہ داروں کو اس انفاق پر مجبور کرنے یعنی سرمایہ کو متحرک اور دولت کو دائر وسائر رکھنے میں جبر سے کام لینے کے بجائے اخلاقی قوت سے کام لیتا ہے، یعنی حب مال اور ہوسِ زر اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بخل وامساک (کنجوسی) کو کافرانہ خصلت اور بدترین رذالت قرار دیتا ہے، ارشاد ہے:

"كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلاً لَّمّاً وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبّاً جَمّاً". (الفجر:۱۷،۱۸،۱۹،۲۰)

ترجمہ:... "کوئی نہیں، بلکہ تم عزت سے نہیں رکھتے یتیم کو اور (ایک دوسرے کو) محتاج کو کھانا کھلانے پر برانگیختہ نہیں کرتے اور کھا جاتے ہو میت کا مال سمیٹ سمیٹ کر اور محبت کرتے ہو مال سے جی بھر کر"۔

۲:... "وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِىْ جَمَعَ مَالاً وَعَدَّدَهٗ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ". (الہمزۃ:۱،۲،۳،۴)

ترجمہ:... "ہلاکت ہے ہر طعنے دینے والے عیب چینی کرنے والے کے لیے، جس نے مال خوب سمیٹا اور گن گن کر رکھا، وہ سمجھتا ہوگا اس کا مال سدا اس کے ساتھ رہے گا، ہرگز نہیں! وہ ضرور جھونکا جائے گا روندڈالنے والی آگ میں"۔

۳:... "اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ وَّاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ وَّاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ". (العادیات:۶،۷،۸)

ترجمہ:... "بیشک انسان اپنے پروردگار کے بارے میں بڑا ہی بخیل ہے اور وہ خود ہی اپنے اس فعل پر گواہ ہے اور وہ مال کی محبت میں بہت ہی سخت ہے"۔

۴:... "وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْراً لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ

سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (آل عمران:۱۸۰)

ترجمہ:... ''نہ گمان کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس چیز (کے خرچ کرنے) میں جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دی ہے کہ یہ بخل ان کے لیے بہتر ہے، بلکہ یہ بخل تو ان کے حق میں بہت ہی برا ہے، طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا وہ مال جس (کے خرچ کرنے) میں انہوں نے بخل کیا ہے''۔

بلکہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے عقیدہ کے تحت دنیوی واخروی ترغیبات وترہیبات اور وعدووعید کے ذریعہ اس انفاق پر آمادہ کرتا ہے۔ قرآن کریم کا شاید ہی کوئی صفحہ آیاتِ انفاق اور دنیا وآخرت میں اس انفاق کے فوائد ومنافع اور بخل وامساک کے دنیوی واخروی نقصان اور مضرتوں کے ذکر سے خالی ہوگا۔

اس لیے قرآن حکیم زراندوز سرمایہ داروں اور مالداروں سے عام حالات میں زبردستی ان کے اموال چھین لینے اور ملکیت سے محروم کردینے کا حکم نہیں دیتا کہ یہ استحصال بالجبر اور ظلم صریح ہونے کے علاوہ معاشی حیثیت سے ملکی پیداوار میں ترقی کو مسدود کردینے اور قوم کے حوصلے اور نشاط کار کو تباہ کردینے کے مرادف ہے اور یہ سب سے بڑا معاشی نقصان اور قومی جرم ہے۔

اسلام کے زریں عہد یعنی قرون اولیٰ.....عہد صحابہؓ وتابعینؒ.....کی تاریخ شاہد ہے کہ اغنیاء صحابہؓ وتابعینؒ نے اسی قرآنی حکمت عملی کے تحت برضا ورغبت اور بطیّب خاطر مذکورہ بالا تمام انفرادی واجتماعی، عارضی ودائمی، قومی مدات ومصارف میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بے حساب اموال خرچ کیے ہیں اور وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ کے تحت جیسے بے حساب اللہ نے ان کو دیا ہے، ویسے ہی بے حساب انہوں نے خرچ کیا ہے، اپنے اوپر بھی اور قوم کے اوپر بھی۔ تاہم چونکہ شحّ ۔۔۔ مال کے خرچ کرنے میں بخل ۔۔۔ انسانی فطرت کی ایک ناگزیر کمزوری ہے، ارشاد ہے:

"وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ". (النساء:۱۲۸)

ترجمہ:... ''اور نفوس انسانی میں بخل اور حرص پیوست ہے''۔

بجز ان خدا سے ڈرنے والے لوگوں کے جن کو رب العالمین اپنے فضل سے اس کمزوری سے بچالے، ارشاد ہے:

"وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ". (التغابن:۱۶)

ترجمہ:... ''اور جو لوگ اپنے نفس کے بخل وحرص سے بچادیئے گئے، وہی ہیں فلاح پانے والے''۔

وہ اغنیاء آج بھی اپنے اسلاف کی طرح کشادہ دل اور کشادہ دست موجود ہیں اور اُنہی کی فراخ دستی کے نتیجہ میں پاکستان واحد ملک ہے، جس میں حکومت کے اثر سے آزاد بیشمار تعلیمی اور رفاہی ادارے چل رہے ہیں، مگر عام طور پر

ملک کا سرمایہ دار اور مالدار طبقہ قرآن وحدیث کی تعلیمات سے بے بہرہ اور ناواقف ہونے کی وجہ سے رب العالمین کے اس فضل سے محروم ہے۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔

بہرحال شح انسان کی ایک فطری کمزوری ہے، جو انفاق فی سبیل اللہ کی راہ میں حائل ہوکر سدراہ بن جاتی ہے، اس لیے قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں ائمہ مجتہدین اور فقہاء کرام نے انفاق کی حسب ذیل مدات میں اسلامی حکومت کو اختیار دیا ہے کہ وہ اغنیاء اور مالی استطاعت رکھنے والے لوگوں کو خرچ پر مجبور کرسکتی ہے۔

۱:... بیوی کا نفقہ شوہر کی مالی استطاعت کے معیار پر۔

۲:... نابالغ اولاد کا نفقہ۔

۳:... ضرورت مند والدین کا نفقہ۔

۴:... معذور قرابت داروں کا نفقہ۔

۵:... مصارفِ حرب ودفاع وامورِ رفاہِ عام، اگر حکومت کے خزانے ..... بیت المال..... میں ان اخراجات کے لیے بقدرِ ضرورت مال نہ ہو۔

۶:... وہ ہنگامی حالات جن میں اسبابِ سماوی کی وجہ سے یا سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے ملک معاشی بحران میں گرفتار ہوگیا ہو، یعنی ملک کا تمام تر سرمایہ اور وسائل دولت چند افراد یا خاندانوں کے ہاتھوں میں سمٹ آئے ہوں اور اکتنازِ زر اور انجمادِ دولت کی صورت پیدا ہوگئی ہو۔

بقیہ: گناہ اور معصیت! مصائب وآفات اور پریشانیوں کا سبب

ایک بزرگ نے یہی بات کیا ہی خوب صورت انداز میں بیان فرمائی ہے کہ: ''یہ خدا ناآشنا زندگی کا لازمی خاصّہ ہے کہ اس کے شیدائی ایک انجانی سی بے قراری کا شکار رہتے ہیں، اس بے قراری کا ایک کرب انگیز پہلو یہ ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بے قرار کیوں ہیں؟ وہ ہمہ وقت اپنے دل میں ایک نامعلوم اضطرار اور پراسرار کسک محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ اضطراب کیوں ہے، کس لیے ہے؟ وہ نہیں جانتے''۔

خلاصہ یہ کہ ہم پر جو پریشانیاں اور مصیبتیں آتی ہیں، وہ ہمارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہیں، لہٰذا پُرسکون اور پُراطمینان زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی گزشتہ کوتاہیوں پر نادم ہوکر اللہ تعالیٰ سے ان پر معافی مانگیں، فی الفور نافرمانی چھوڑ کر آئندہ اپنے اعمال کی اصلاح کریں۔

واللہ الموفّق والمعین وبہ نستعین واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علوم الحدیث کا اجمالی تعارف

(دوسری وآخری قسط)

مولانا مفتی محمد طارق

۳: سنداور متن دونوں سے متعلق انواع : ۵۳ - ۷۸

راوی کے ضبط یا عدالت میں کمی کے مختلف صورتوں میں ظہور سے مختلف انواع بنتی ہیں۔جیسے:

۵۳:المدرج: جس کی سند یا متن میں راوی اپنی طرف سے کچھ بڑھادے،بغیر بتائے ہوئے۔(الملخص فی اصول الحدیث:ص۵۴)۔اس موضوع پر ابن حجر کی تقریب المنهج بترتیب المدرج ہے۔

۵۴:المقلوب: جس کی سند یا متن میں تقدیم وتاخیر کے ذریعے تبدیلی ہوجائے۔اس نوع پر خطیب کی رافع الارتیاب فی المقلوب من الاسماء والالقاب ہے۔

۵۵:المضطرب: جس کی سند یا متن میں ایسا اختلاف ہو کہ تطبیق اور ترجیح نہ ہوسکے۔اضطراب زیادہ تر سند میں ہوتا ہے،کبھی متن میں ہوتا ہے۔(الملخص فی اصول الحدیث:ص۵۲،۵۳)

۵۶:المصحف: جس کی سند یا متن کے کسی کلمے کی صحیح ہیئت بدل دی گئی ہو۔اس نوع پر خطابی کی اصلاح خطأ المحدثین ہے۔اورعسکری کی تصحیفات المحدثین ہے۔

۵۷- ۶۰ : الشاذ والمحفوظ و المنکر والمعروف : اگر ثقہ راوی اوثق کے خلاف روایت کرے تو ثقہ کی روایت شاذ اور اوثق کی محفوظ کہلاتی ہے۔اور اگر ضعیف راوی ثقہ کے خلاف روایت کرے تو ضعیف کی روایت منکر اور ثقہ کی معروف کہلاتی ہے۔یہ تعریفیں ابن حجر رحمہ اللہ نے ذکر کی ہیں۔مولانا عبدالعظیم بلیاوی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے ابن حجر سے پہلے کسی کے کلام میں شاذ اور منکر میں یہ فرق نہیں ملا کہ شاذ ثقہ کی روایت کے ساتھ خاص ہو،اور منکر ضعیف کی روایت کے ساتھ خاص ہو۔ممکن ہے عموما ایسے ہی ہوتا ہو،لیکن اسے ضابطہ کلیہ بنانا مشکل ہے۔شاذ اور منکر دونوں مترادف ہیں،اور دونوں کا اطلاق ثقہ اور ضعیف دونوں قسم کے راویوں کی روایتوں پر ہوتا ہے۔شاذ اسے کہتے ہیں جسے روایت کرنے والا اکیلا ہو،اور اس سے ناقد کو خلجان ہو۔اور یہی منکر کی تعریف

ہے۔اور خلجان کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔جیسے: راوی کا ضعیف ہونا، یا اوثق کی روایت کے مخالف ہونا، یا متن کا شہرت کا تقاضا کرنا وغیرہ وغیرہ۔حنفیہ کے نزدیک شاذ اسے کہتے ہیں جو کتاب اللہ، یا سنت ثابتہ یا اجماع امت کے خلاف ہو یا خبر واحد ہو اور عموم بلوی کے بارے میں ہو۔(دیکھیے: الملخص فی اصول الحدیث:ص۴۲ - ۴۷، فتح الملہم:۱/۱۳۲) فاحش الغلط، کثیر الغفلۃ اور ظاہر الفسق راوی کی روایت بھی منکر کہلاتی ہے۔(نزہۃ النظر :ص۹۲، ت:عتر)

۶۱: المعلل :جس کی سند یا متن میں پوشیدہ خرابی ہو جس سے حدیث صحیح نہ رہے۔اس خرابی کو علت کہتے ہیں۔علت عموما سند میں ہوتی ہے، اور کبھی متن میں بھی ہوتی ہے۔یہ خرابی اصل میں راوی کے وہم سے پیدا ہوتی ہے۔اس نوع کو اغمض انواع علوم الحدیث کہا جاتا ہے۔کبھی علت کا اطلاق ہر خرابی پر ہوتا ہے، خواہ پوشیدہ بھی نہ ہو، اور حدیث کے صحیح ہونے پر اثر انداز بھی نہ ہو۔(محدثین کی علل کا تعلق عموما سند سے ہوتا ہے، اور فقہاء کی علل کا تعلق عموما متن سے ہوتا ہے۔دیکھیے: تدریب الراوی:۳/۳۴۵ - ۳۴۷ تعلیق۔محدثین کے ہاں علل کی کل دس انواع بنتی ہیں۔علل پر سب سے جامع کتاب دارقطنی کی ہے۔(تدریب الراوی:۳/۳۷۲-۳۸۲)

۶۲:زیادۃ الثقۃ :ثقہ راوی کی جانب سے حدیث کی سند یا متن میں ہونے والا اضافہ۔سند میں اضافے کی متعدد صورتیں ہیں۔ایک المزید فی متصل الاسانید کے تحت گزر چکی۔وصل وارسال کا تعارض اور وقف ورفع کا تعارض خاص طور پر اس نوع میں زیر بحث آتا ہے۔تفصیل کے لیے دیکھیے: تدریب الراوی:۳/۲۳۰-۲۳۸، ۳۱۹-۳۳۱ مع تعلیق۔فتح الملہم:۱/۲۹، ۳۰

۶۳،۶۴ : الموضوع والمتروک :جس حدیث کا راوی کذاب ہو، اور اس کا متن قواعد معلومہ فی الدین کے خلاف ہو اسے **موضوع** کہتے ہیں۔(الموقظۃ:ص۳۶) درحقیقت یہ کسی اور کا کلام ہوتا ہے جس کی جھوٹی نسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کردی جاتی ہے۔اور جس حدیث کا راوی متہم بالکذب ہو، اور وہ حدیث صرف اسی ایک راوی سے منقول ہو، اور قواعد معلومہ فی الدین کے خلاف ہو، اسے **متروک** کہتے ہیں۔(متہم بالکذب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی روایت جو قواعد معلومہ فی الدین کے خلاف ہو، اسے روایت کرنے میں اکیلا ہو یا حدیث نبوی میں اس کا جھوٹ بولنا ثابت نہ ہو، لیکن اپنی گفتگو میں اس کا جھوٹ بولنا ثابت ہو۔تدریب الراوی :۳/۵۱۰، ۵۱۱ تعلیق)۔موضوع احادیث کی پہچان کے ضوابط اور علامات: لمحات میں تاریخ السنۃ وعلوم الحدیث:ص ۱۱۷-۱۲۸، شیخ عبدالفتاح ابوغدۃ۔موضوعات پر ایک جامع کتاب ابن عراق کنانی (م۹۶۳ھ) کی **تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاحادیث الشنیعۃ الموضوعۃ** ہے۔

۶۵- ۷۰ : الصحیح لذاتہ والحسن لذاتہ والصحیح لغیرہ والحسن لغیرہ والضعیف والمضعف :

ا: حدیث صحیح اپنے معنی اخص میں، متاخرین کے ہاں بخاری اور مسلم کے زمانے سے، وہ ہے جسے عدل حافظ اپنے جیسے سے روایت کرے بغیر شذوذ وعلت کے۔ اور اپنے معنی اعم میں، متقدمین محدثین اور سب فقہاء واصولیین کے ہاں، وہ ہے جو معمول بہ ہو۔ لہذا متاخرین محدثین میں سے اگر کوئی کسی حدیث کو ضعیف کہے تو اس سے حدیث کا غیر معمول بہ ہونا لازم نہیں آتا۔ (التحفۃ المرضیۃ فی حل بعض مشکلات الحدیثیۃ :ص ۲۶) متاخرین کے ہاں حدیث صحیح کے معنی کا حاصل یہ ہے کہ یہ حدیث ثابت ہے۔

۲: جس خبر واحد کی سند متصل ہو، اور اس کے سب راوی عدل ضابط ہوں، اور معلل اور شاذ نہ ہو، اسے صحیح لذاتہ کہتے ہیں۔ (نزہۃ النظر :ص ۵۸) یہ تعریف حافظ ابن صلاح شافعی (م ۶۴۳ھ) رحمہ اللہ کی ذکر کردہ تعریف سے معمولی ترمیم کے ساتھ ماخوذ ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ابن صلاح نے یہ تعریف امام مسلم (م ۲۶۱ھ) کے کلام سے لی ہے۔ (تدریب الراوی :۲/۱۶۳)۔ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ یہ اُس حدیث صحیح کی تعریف ہے جس کے صحیح ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے (یعنی امام بخاری اور مسلم کے زمانے سے محدثین کا اتفاق ہے، جیسا کہ اوپر التحفۃ المرضیۃ کے حوالے سے گزرا)۔ اور کبھی ان (محدثین) میں کسی حدیث کے صحیح ہونے میں اختلاف ہو جاتا ہے، ان اوصاف میں سے کسی وصف کے پائے جانے یا کسی وصف کے شرط ہونے میں اختلاف کی وجہ سے۔ اور حدیث کو صحیح کہنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی سند ان شرائط پر پوری اترتی ہے، اس سے یہ لازم نہیں کہ اس حدیث کا ثبوت نفس الامر میں بھی مقطوع ہے۔ (کیونکہ صحیح خبر واحد ظنی الثبوت ہوتی ہے، نہ کہ قطعی الثبوت)۔ اسی طرح جب یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اس کا نفس الامر میں غلط ہونا مقطوع ہے، کیونکہ کبھی نفس الامر میں ثابت ہوتی ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ شرائط پر اس کی سند ثابت نہیں۔ (مقدمہ ابن صلاح :ص ۱۳، ۱۴، ت :عتر) سند یا متن میں سے ایک کے صحیح ہونے سے دوسرے کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔ (تدریب الراوی :۲/۵۵۴، تعلیق)۔ لہذا کل چار صورتیں بنتی ہیں: سند اور متن دونوں صحیح، دونوں ضعیف، سند صحیح متن ضعیف اور سند ضعیف متن صحیح۔

۳: کسی امر خارج کی وجہ سے قوت حاصل ہونے سے حدیث کو اگر صحیح قرار دیا جائے تو اسے صحیح لغیرہ کہتے ہیں۔ امر خارج جیسے تلقی بالقبول، تعدد طرق وغیرہ۔ (قواعد التحدیث :ص ۸۰) حسن صحیح اور ضعیف کا درمیانی درجہ ہے۔ اس کی جامع تعریف دشوار ہے۔ حافظ ابن حجر نے حسن لذاتہ کی یہ تعریف کی ہے کہ جس کے راوی کا ضبط کچھ کم ہو اور باقی ساری شرائط صحیح لذاتہ کی پائی جائیں۔ (تدریب الراوی :۳/۲۰، ۲۱ مع تعلیق) اکثر محدثین حسن کو صحیح سے

الگ نہیں کرتے۔(النکت علی کتاب ابن الصلاح:۱/۴۸۰) لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ متقدمین کے ہاں حدیث کی صرف دو ہی قسمیں تھیں: صحیح اور ضعیف۔اور حدیث حسن، امام ترمذی سے شروع ہونے والی اصطلاح ہے۔(الفوائد المستمدۃ:ص۱۴۰- ۱۵۱) جو حدیث (خبر واحد) صحیح اور حسن نہ ہو اُسے ضعیف کہتے ہیں۔یعنی اس میں صحیح اور حسن کی کل یا بعض شرائط نہیں پائی جاتیں۔(ظفر الامانی:ص۱۷۸) حدیث ضعیف کا ضعف جب دور ہو جائے تو وہ حسن لغیرہ بنتی ہے۔جس حدیث کے ضعیف ہونے پر اتفاق نہ ہو، بلکہ بعض نے اسے ضعیف قرار دیا ہو، بعض نے قوی کہا ہو اسے مضعف کہتے ہیں۔یہ ضعیف سے اوپر کا درجہ ہے۔(ارشاد الساری:۱/۸، الغایۃ فی شرح الھدایۃ:۱/۱۵۵) صحیح ،حسن اور ضعیف تینوں میں سے ہر ایک کے مختلف درجے ہیں۔(حدیث (خبر واحد) کی بنیادی قسمیں تین ہیں: صحیح ،حسن اور ضعیف۔باقی سب قسمیں ان تینوں میں داخل ہیں۔مقدمہ شیخ عبدالحق:ص۱۸)

شیخ ابن ہمام کہتے ہیں:ضعیف کے یہ معنی نہیں کہ یہ (متن) نفس الامر میں باطل ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ محدثین کے ہاں معتبر شروط پر اس کا ثبوت نہیں، اس کے ساتھ نفس الامر میں (اس متن کے) صحیح ہونے کا احتمال رہتا ہے۔تو ہوسکتا ہے کوئی قرینہ ایسا مل جائے جو اس (مرجوح احتمال) کو ثابت (راجح) کردے، اور یہ کہ ضعیف راوی نے اس معین متن کو صحیح طرح ادا کیا ہے، تو یہ حکم کردیا جائے گا۔(فتح القدیر:۱/۳۰۶، نیز دیکھیے:۲/۱۲۴)۔حدیث ضعیف کو اعتقادی اور عملی طور پر اس کے درجے پر رکھنا چاہیے۔نہ اس سے بڑھایا جائے اور نہ اس سے گھٹایا جائے ۔ضعیف حدیث کے موضوع پر سب سے مفصل تحقیق شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ کا رسالہ **حکم العمل بالحدیث الضعیف بین النظریۃ والتطبیق والدعوی** ہے۔

۴: فقہاء واصولیین کے نقطہ نظر سے حدیث صحیح کی تعریف کا جائزہ: امام جصاص حنفی (م۳۷۰ھ) کہتے ہیں :فقہاء کا طریقہ (اصول)، احادیث کے قبول کرنے میں محدثین کا طریقہ نہیں۔اور ہمیں نہیں معلوم کہ فقہاء میں سے کسی نے احادیث کے قبول ورد کے سلسلے میں ان (محدثین) کی طرف رجوع کیا ہو یا ان کے اصول کا اعتبار کیا ہو۔(شرح مختصر الطحاوی:۴/۲۴۴) ابن دقیق عید مالکی شافعی (م۷۰۲ھ) کہتے ہیں حدیث صحیح کا دارومدار فقہاء اور اصولیین کے اصول کی رو سے راوی کی اس عدالت پر ہے جو قبول شہادت کے لیے شرط ہے، جیسا کہ فقہ میں ثابت ہے۔اور ان میں سے جو مرسل کو قبول نہیں کرتے انھوں نے اتصال سند کی قید بھی لگادی۔اور محدثین نے شاذ اور معلل نہ ہونے کی قیدیں بھی بڑھادیں۔اور یہ دونوں شرطیں (عدم شذوذ وعلت) فقہاء کے اصول کی رو سے محل تأمل ہیں، کیونکہ محدثین کی ذکر کی ہوئی بہت سے علتیں فقہاء کے اصول کی رو سے معتبر نہیں ہوتیں۔(الاقتراح:ص ۲۱۵-۲۱۸، ت:قحطان عبدالرحمٰن) قاضی ابویعلی حنبلی (م۴۵۸ھ) کہتے ہیں: وہ (محدثین حدیث کو) ایسی علتوں

کی وجہ سے ضعیف قرار دیتے ہیں جن سے فقہاء کے نزدیک حدیث ضعیف نہیں ہوتی ۔ جیسے ارسال ،تدلیس ،تفرد بالزیادۃ ۔(العدۃ فی اصول الفقہ :۳/۹۴۱)

فقہاء اور اصولیین کے نزدیک صحیح کے لیے عدم شذوذ کی شرط نہیں ۔(النکت علی کتاب ابن الصلاح لابن حجر:۱/۱۰۶) حدیث صحیح کی تعریف میں اتصال سند کی قید اکثر محدثین کے مذہب کی بنا پر ہے ۔ورنہ قرون ثلاثہ کی مرسل ہمارے فقہائے حنفیہ کے ہاں حجت ہے ۔اسی طرح مرسل مالک اور کوفیین کے ہاں حجت ہے ۔(امعان النظر :ص۴۷) جمہور فقہاء کے ہاں صحیح کے لیے اتصال سند کی شرط نہیں ۔ برخلاف امام شافعی کے ،اور جمہور محدثین نے اس بارے میں ان کی پیروی کی ہے ۔(الملخص فی اصول الحدیث:ص۳۷)

سند کے اتصال وانقطاع کے بارے میں حنفیہ کے مذہب کی مزید تفصیل یہ ہے کہ سند میں سے جتنے بھی راوی محذوف ہوں ،اور جہاں سے بھی محذوف ہوں سب کو مرسل کہتے ہیں ۔(المدخل الی اصول الحدیث علی منہج الحنفیۃ :ص۲۱۶،۲۱۷) یعنی متقدمین محدثین اور فقہاء واصولیین کی اصطلاح ہے ۔جیسے نوع ۴۰ - ۴۵ میں گزرا۔ نیز قرون ثلاثہ کے (ثقہ)راوی کا ارسال مقبول ہے ،حدیث کے صحیح ہونے کے خلاف نہیں ،اس سے حدیث ضعیف نہیں ہوتی الا یہ کہ اس کا غیر ثقہ سے ارسال کرنا ثابت ہوجائے ۔اور قرون ثلاثہ کے بعد کے راوی کا ارسال مقبول نہیں الا یہ کہ وہ راوی ثقہ سے ہی روایت کرنے میں مشہور ہو۔(الفصول فی الاصول للجصاص الرازی :۳/۱۴۵ - ۱۴۷ مع التعلیق ،ت: عجیل جاسم، نیز دیکھیے :فتح الملہم :۱/۹۱،۹۲،جامع التحصیل لاحکام المراسیل :ص۳۳)۔ نیز تدلیس بھی ارسال کے حکم میں ہے اور اس میں بھی وہی تفصیل ہے جو ارسال میں ہے ۔(المدخل الی اصول الحدیث علی منہج الحنفیۃ :ص۲۲۹، نیز دیکھیے :الکفایۃ فی علوم الروایۃ :۱/۳۶۱) بعض محدثین کا بھی تدلیس کے بارے میں وہی مذہب ہے جو حنفیہ اور مالکیہ کا ہے، کہ جو ثقہ سے تدلیس کرے اس کی تدلیس مقبول ہے ۔(المدخل الی اصول الحدیث علی منہج الحنفیۃ :ص۲۳۰،۲۲۹ملخصا)۔حنفیہ کے ہاں قرون ثلاثہ کے راوی کے عادل ہونے کے لیے عدالت باطنی کا ثبوت ضروری نہیں ،عدالت ظاہری بھی کافی ہے ،اور مجہول العدالۃ الباطنۃ بھی عادل سمجھا جائے گا ،اور اسکی روایت مقبول ہوگی کسی قدر تفصیل کے ساتھ ۔اور محدثین کی ایک جماعت کے ہاں بھی مستور کی روایت مقبول ہے ،حتی کہ صحیحین کے بہت سے روای بھی مستور ہیں ۔اور قرون ثلاثہ کے بعد عدالت باطنی کا ثبوت ضروری ہے ۔(المدخل الی اصول الحدیث علی منہج الحنفیۃ :ص۶۴،۶۵،۷۱،۷۳،دراسات فی اصول الحدیث علی منہج الحنفیۃ :ص۱۸۱،۱۸۲،دراسات الکاشف :۱/۱۱۱)

محدثین عدالت کی تعریف میں ملکہ کا ذکر کرتے ہیں ۔یعنی گناہوں اور خلاف مروت کاموں سے بچنے کی پختہ

عادت۔فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان چیزوں سے بچنا کافی ہے، اگر چہ ملکہ نہ ہو، بلکہ مجاہدہ نفس سے بچے۔(تدریب الراوی:۲/۱۴۰،تعلیق،فواتح الرحموت:۲/۱۷۶،۱۷۷)

۵:قدماءمحدثین کے نقطہ نظر سے حدیث صحیح کی تعریف کا جائزہ :مولانا شیخ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بہت سے قدماءمحدثین کے عمل سے ظاہر یہ ہے کہ ان کے ہاں صحیح کے لیے عدم شذوذ وعلت کی شرط نہیں تھی۔اور نہ ہی ان کے ہاں شاذ،منکر اور معلل کے(متاخرین کے)اصطلاحی فروق تھے۔(فتح الملہم:۱/۱۳۲)

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:سند جب متصل ہو اور اس کے سب راوی عادل ضابط ہوں تو علل ظاہرہ کی نفی ہوگئی ۔پھر جب اس کے معلول ہونے کی بھی نفی ہوگئی تو اسے صحیح قرار دینے سے کیا مانع ہے؟ پس صرف اتنی بات کہ ایک راوی نے اپنے سے زیادہ ثقہ کی مخالفت کی ہے، یا اپنے سے زیادہ تعداد کے رواۃ کی مخالفت کی ہے،اس (مخالفت کرنے والے کی حدیث کا) ضعیف ہونا لازم نہیں آتا۔بلکہ یہ صحیح اور اصح کی قبیل سے ہوگا۔ابن حجر کہتے ہیں کہ اس کے باوجود مجھے ائمہ حدیث میں سے کسی سے (صحیح کے لیے)،شذوذ کی نفی کی شرط نہیں ملی۔محدثین نے اس صورت میں بعض کو بعض پر صحت میں مقدم کیا ہے۔اور اس کی مثالیں صحیحین وغیرہ میں موجود ہیں۔اور اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔اور ہر (حدیث) صحیح پر عمل ہونا ضروری نہیں۔اور اگر یہ مان لیا جائے کہ مخالف مرجوح کی حدیث صحیح نہیں کہلاتی،تو پھر بھی اس (شذوذ) کی نفی کو حدیث کی صحت کی شرط ٹھہرانا محل تأمل ہے۔بلکہ جب شروط مذکورہ (رواۃ کی عدالت وضبط وعدم علل) پائی جائیں تو حدیث کو صحیح قرار دیا جائے گا جب تک شذوذ ثابت نہ ہو۔کیونکہ اصل عدم شذوذ ہے، کیونکہ راوی عادل وضابط ہے،تو اصل یہی ہے کہ اس نے اپنی روایت کو یاد رکھا ہے، یہاں تک کہ اس کے خلاف ثابت ہوجائے ۔(تدریب الراوی :۲/۱۴۹ - ۱۵۳ ملخصا) امام ابوداؤد رحمہ اللہ فرماتے ہیں : (حدیث) مرسل سے، پہلے علماء دلیل لیتے تھے، جیسے سفیان ثوری، مالک بن انس اور اوزاعی، حتی کہ امام شافعی نے آکر اس پر کلام کیا۔(رسالۃ ابی داؤد:ص۵،ت:کوثری) مرسل کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے :فقہ اھل العراق وحدیثھم:ص۳۲-۳۴،تدریب الراوی:۲/۱۴۱-۱۴۸،تعلیق۔

۶: اسناد صحیح نہ ہو،تو تلقی بالقبول کی وجہ سے بھی حدیث صحیح قرار دی جاتی ہے ۔(تدریب الراوی :۲/۱۵۴،الباعث الحثیث:۱/۳۶)

۷: حافظ ابن حجر کہتے ہیں:(حدیث) صحیح کی تعریف میں (ایک قید کا) اضافہ ہونا چاہیے۔یوں کہنا چاہیے: وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو،عدل تام الضبط کے، یا قاصر الضبط کے اپنے جیسے سے نقل کرنے کے ساتھ آخر تک ،اور وہ شاذ ومعلل نہ ہو۔یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ میں نے صحیحین کی بہت سی احادیث کا جائزہ لیا تو اس قید کے

بغیر ان پر صحیح ہونے کا حکم نہیں لگتا۔(النکت علی کتاب ابن الصلاح:۱/ ۴۱۷)

۸: صحیح حدیث کی تقسیم سبعی: کتب فن میں حدیث صحیح کی ایک تقسیم سبعی مشہور ہے۔یعنی یہ کہ ۱: سب سے اعلی مرتبے کی صحیح حدیث وہ ہے جسے امام بخاری اور امام مسلم نے ذکر کیا ہو(اپنی اپنی صحیح میں)،۲: پھر جسے صرف امام بخاری نے ذکر کیا ہو،۳: پھر جسے صرف امام مسلم نے ذکر کیا ہو،۴: پھر جو امام بخاری و مسلم دونوں کی شرط پر ہو،(اور اپنی کتاب میں انھوں نے ذکر نہ کی ہو)،۵: پھر جو امام بخاری کی شرط پر ہو،۶: پھر جو امام مسلم کی شرط پر ہو،۷: پھر جو ان دونوں کے علاوہ کسی کے نزدیک صحیح ہو،اوران دونوں کی شرط پر نہ ہو۔

یہ تقسیم ابوحفص میانجی (م۵۸۳ھ) کے رسالے **مالا یسع المحدث جھلہ** سے ماً خوذ معلوم ہوتی ہے۔اوران سے پہلے کسی کے کلام میں نہیں دیکھی۔ابن جوزی نے موضوعات کے مقدمے میں اس طرح کی ایک تقسیم سداسی ذکر کی ہے مطلق حدیث کی ۔شاید انھوں نے میانجی کی تقسیم کو بنیاد بنایا ہو۔پھر ابن صلاح نے آ کر حدیث صحیح کی یہ ۷ قسمیں کردیں اور یہ تقسیم پھیل گئی اور مقبول سمجھی جانے لگی ۔لیکن درحقیقت یہ سب تقسیمات کمزوریوں اورخرابیوں سے خالی نہیں۔دیکھیے: **الفوائد المستمدۃ من تحقیقات العلامۃ الشیخ عبد الفتاح أبی غدۃ فی علوم مصطلح الحدیث** :ص۱۲۱-۱۳۶

۹: جرح وتعدیل اور تصحیح وتضعیف کا آخری فیصلہ فقیہ مجتہد یا محدث کے ذوق اور بصیرت سے ہوتا ہے،اوراس بارے میں نری قواعد بازی کافی نہیں۔اسی ذوق اور وجدان کی شہادت کی وجہ سے کتب میں لکھے ہوئے قواعد بسا اوقات اکثری یا اس سے کم درجے کے رہ جاتے ہیں۔(دیکھیے: تدریب الراوی :۴/ ۴۹،۵۰ ج۳،بذل المجھود :۲۰/ ۲۴۲،المدخل الی علوم الحدیث الشریف:ص۱۶۱-۱۶۴) اوراس میں بھی فقہاء کا معیار محدثین کے معیار سے مختلف ہے۔چنانچہ امام ابن دقیق عید(م۷۰۲ھ) اپنی کتاب **الالمام باحادیث الاحکام** کے خطبے میں فرماتے ہیں:اس کتاب میں میری شرط یہ ہے کہ میں وہی حدیث لاؤں گا جو محدثین یا فقہاء کے طریقے (اصول) پر صحیح ہو،کیونکہ ان دونوں کا طریقہ ایک دوسرے سے جدا ہے،اور ہر ایک میں خیر ہے۔(الالمام باحادیث الاحکام :۱/ ۷،۴ ملخصا) لہذا ہمارے لیے سلامتی اس میں ہے کہ راوی اور مروی کے بارے میں محقق اہل علم کے اقوال نقل کرنے کی حد تک رہیں،فقہاء کے طریقے پر یا محدثین کے طریقے پر،جیسا کہ فروع فقہیہ کے فتاوی میں فقہاء کے کلام سے صریح جزئیات ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۰: راوی کی ثقاہت یا ضعف یا روایت کا صحیح یا ضعیف ہونا اگر کسی اصل مختلف فیہ پر مبنی ہو تو اس کا ذکر کرنا چاہیے کہ فلاں کے اصول کی رو سے یہ حکم ہے۔اوردوسروں کے نزدیک یہ حکم ہے۔اس کا ایک نمونہ ابن جریر طبری (۲۲۴-

۳۱۰ھ) کی تہذیب الآثار میں جابجا اس طرح کا عنوان نظر آتا ہے : **ذکر ماصح عندنا سندہ من حدیث کذا** (فلاں حدیث جس کی سند ہماری رائے میں صحیح ہے اس کا ذکر) **القول فی علل ھذا الخبر : وھذا الخبر عندنا صحیح سندہ لاعلة فیه توھنه ولاسبب یضعفه ، وقد یجب ان یکون علی مذھب الآخرین سقیما غیر صحیح لعلل احداھا...،** (اس حدیث کی علل کی وضاحت: اور اس حدیث کی سند ہمارے نزدیک صحیح ہے، اس میں کوئی کمزوری اور خرابی نہیں ہے، اور دوسروں کی رائے کی بنا پر اسے ضعیف غیر صحیح ہونا چاہیے، ان خرابیوں کی وجہ سے۔ پہلی یہ کہ.....) (مثلا دیکھیے قسم اول: ص۱۰، ۱۱، ۸۵، ۱۲۰، ۱۵۵، ۱۶۳، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۳۹۔ مطابع الصفا، مکۃ المکرّمۃ، ت: ناصر بن سعد، ط: ۱۴۰۴ھ) اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اہل اجتہاد کے لیے اس باب میں اختلاف رائے کی کتنی گنجائش ہے۔ اور یہ کہ اجتہادیات کے دلائل میں وسعت نظر اور تحمل سے کام لیا جاتا ہے۔ اور یہ کہ مختلف فیہا اصول کو سب پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ اس بارے میں مزید تفصیل بندہ نے اپنے دوسرے مضمون ''محدثین اور فقہاء کے اصول حدیث کا تقابلی جائزہ'' میں ذکر کی ہے۔ یہ مضمون مجلّہ صفدر نمبر ۱۱۱، ۱۱۲ میں شائع ہوا تھا۔ اور پھر معمولی ترمیم کے ساتھ المصباح سے مطبوع خیر الاصول کے آخر میں بھی شامل ہے

۷۱ – ۷۵ :المتواتر والمشھور والعزیز والغریب والفرد: محدثین متواتر سے بحث نہیں کرتے ، بلکہ فقہاء اور اصولیین کے حوالے کرتے ہیں۔ (مأخذہ: تدریب الراوی: ۵/۲۷، ۲۸، نزہۃ النظر: ص۴۵) حنفیہ کے ہاں (سنت کی ثبوت کے لحاظ سے) بنیادی طور پر تین قسمیں بنتی ہیں: متواتر، مشہور اور خبر واحد۔ پہلی قسم تینوں زمانوں (صحابہ، تابعین، تبع تابعین) میں حد تواتر کو پہنچتی ہے۔ دوسری قسم آخری دونوں زمانوں میں حد تواتر کو پہنچتی ہے۔ اور تیسری قسم پہلے دونوں زمانوں میں حد تواتر کو نہیں پہنچتی۔ اور جمہور کے ہاں دو قسمیں بنتی ہیں: متواتر، خبر واحد۔ (مأخذہ: الوجیز فی اصول الفقہ للزحیلی: ص۳۶، ۳۷) تواتر کی چار قسمیں ہیں: ۱: تواتر طبقہ: جیسے قرآن مجید کا تواتر۔ ۲: تواتر عمل: جیسے وضو میں مسواک۔ ۳: تواتر قدر مشترک: مختلف الفاظ میں مروی متون کا قدر مشترک حد تواتر کو پہنچے۔ اسے تواتر معنوی بھی کہتے ہیں۔ ۴: تواتر اسناد۔ مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں ان چاروں قسم کے تواتر کی جزئیات اہل علم کے کلام میں منتشر تھیں اور تواتر کی قسموں میں ان کا ذکر نہیں ملتا تھا۔ ہمارے علم کے مطابق سب سے پہلے ان قسموں کو اکٹھا کر کے الگ الگ نام حضرت انور شاہ قدس سرہ نے دیے ہیں۔ اور یہ بڑی عمدہ تقسیم ہے۔ (دیکھیے: فتح الملہم: ۱/۱۷ – ۱۹، احسن الخبر لمولانا حسن جان: ص۲۰، ۲۱، نیز تعامل کی اہمیت کے لیے دیکھیے: الامام ابن ماجۃ وکتابہ السنن: ص۸۱ – ۹۰ مع حواشی الشیخ أبی غدۃ)

محدثین خبر واحد کو عدد رُواۃ کے لحاظ سے تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں: غریب، عزیز اور مشہور۔ مشہور ائمہ سے

نقل کرنے والا اگر صرف ایک راوی ہوتو اسے غریب کہتے ہیں، اور اگر دو یا تین ہوں تو عزیز، اور اگر کم از کم چار ہوں تو مشہور کہتے ہیں۔(مأ خذہ: الملخص فی اصول الحدیث:ص۲۹،۳۰ مع حواشی) غریب کی دو قسمیں ہیں: اگر کوئی حدیث صرف ایک ہی سند سے مروی ہوتو اسے فرد مطلق کہتے ہیں۔اور اگر کئی سندوں سے مروی ہو لیکن کسی خاص سند کے اعتبار سے اس میں غرابت ہوتو اسے فرد نسبی کہتے ہیں۔(مصدر سابق:ص۳۱) فرد اور غریب دونوں لغۃ اور اصطلاحا مترادف ہیں، البتہ کسی قدر فرق ان میں کیا جاتا ہے۔(دیکھیے: الغایۃ فی شرح الہدایۃ:ص۱۸۷)

۷۶،۷۷: المتابع والشاهد: جو حدیث دوسری کے موافق ہو لفظا اور معنی دونوں طرح یا صرف معنی میں، اور دونوں ایک ہی صحابی سے مروی ہوں اسے متابع کہتے ہیں۔اور اگر کسی اور صحابی سے مروی ہوتو اسے شاہد کہتے ہیں۔ایک جماعت نے متابع میں لفظی موافقت کا اعتبار کیا ہے، چاہے صحابی راوی ایک ہو یا نہ۔اور شاہد میں معنوی موافقت کا اعتبار کیا ہے، چاہے صحابی راوی ایک ہو یا نہ۔متابع اور شاہد ایک دوسرے کی جگہ بھی بولے جاتے ہیں۔متابع کی تلاش کے لیے سندیں تلاش کرنے کا عمل اعتبار کہلاتا ہے۔(نزہۃ النظر:ص۷۳-۷۵ ملخصا)

۴: صرف متن سے متعلق انواع : ۷۸ - ۸۴

۷۸: غـريب الحديث : متن حدیث کے جس لفظ کے معنی واضح نہ ہوں اسے غریب الحدیث کہتے ہیں۔اس نوع کی بہترین کتب میں ابن اثیر(م۶۰۶ھ) کی **النـهـايـه فـی غـريـب الحديـث والاثـر** اور محمد طاہر پٹنی (م۹۸۶ھ) کی **مجمع بحار الانوار** ہے۔یہ کتاب غریب القرآن والحدیث کی جامع ہے۔(مأ خذہ: تدریب الراوی:۶۵/۵،۶۸ مع تعلیق)

۷۹: اسباب ورود الحديث: اس نوع پر سب سے جامع کتاب ابن حمزہ(۱۱۲۰ھ) کی **البيان والتعريف فی اسباب ورود الحديث** ہے۔

۸۰ - ۸۴ : مـحكم الحديث ومختلف الحديث ومشكل الحديث وناسخ الحديث ومنسوخه : جس حدیث کے کوئی دوسری حدیث معارض نہ ہو اسے محکم الحدیث کہتے ہیں۔(مأ خذہ: نزہۃ النظر:ص۷۶) اگر دو یا زائد حدیثوں کے معنی میں تعارض ہوتو اسے مختلف الحدیث کہتے ہیں۔اور اگر حدیث کا کسی دوسری دلیل شرعی (حدیث یا غیر حدیث) سے تعارض ہوتو اسے مشکل الحدیث کہتے ہیں۔یہ مختلف الحدیث سے اعم ہے۔امام طحاوی کی **شـرح مـعانی الآثار** مختلف الحدیث کے موضوع پر ہے، اور یہ ان کی پہلی تصنیف ہے۔اور **شـرح مشكل الآثار** مشکل الحدیث کے موضوع پر ہے، یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔رفع تعارض ان ائمہ کا کام ہے جو حدیث اور فقہ کے جامع ہیں اور ان اصولیین کا کام ہے جو معانی کی گہرائی تک پہنچتے ہیں۔(تدریب الراوی:۱۱۴/۵-۱۱۷ مع تعلیق)

رہی یہ بات کہ اس حدیث کا کوئی معارض ہے یا نہیں؟ سو یہ بات دلائل شرعیہ کے استقراء سے معلوم ہوتی ہے ،اور یہ کام مجتہد کا ہے، غیر مجتہد کا استقراء معتبر اور کافی نہیں۔ دیکھیے :اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمۃ الفقہاء للشیخ محمد عوامۃ :ص۳۹- ۵۲) حاکم کہتے ہیں شاید کسی کو یہ وہم ہو کہ ایک صحیح حدیث کے معارض دوسری صحیح حدیث نہیں ہوتی ! اسے چاہیے کہ صحیح مسلم میں غور کرے ،اس طرح کی مثالیں اتنی کثرت سے ملیں گی کہ جی بھر جائے گا۔(المستدرک علی الصحیحین :۳۴۹/۱) اور بہت سی صحیح احادیث کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے ۔(ظفر الامانی :ص۴۵۸) اور عامی کے لیے (براہ راست) ظاہر حدیث پر عمل کرنا درست نہیں ہوتا، مصروف عن الظاہر یا منسوخ ہونے کے احتمال کی وجہ سے، بلکہ عامی کا کام مفتی کے فتوی پر عمل ہے۔(المبسوط للسرخسی :۸۰/۳)

حازمی نے ۵۰/ وجوہ ترجیح ذکر کی ہیں۔عراقی نے انھیں ۱۱۰/ تک پہنچایا ہے اور ۱۱۰ ویں نمبر پر یہ وجہ ترجیح ذکر کی ہے کہ کسی حدیث کے اخراج پر شیخین (امام بخاری و مسلم) کا اتفاق ہو۔اور شوکانی نے ۱۶۰/ تک پہنچایا۔لیکن ان میں بھی انحصار نہیں۔مدار مجتہد کے ظن پر ہے۔(تدریب الراوی :۱۲۳/۵-۱۳۲ مع تعلیق) بسا اوقات دونوں جانب کے دلائل کو بعض بعض وجوہ سے ترجیح ہوتی ہے، ایسی صورت میں دیکھا جاتا ہے کہ کس جانب زیادہ قوی وجوہ ترجیح ہیں؟ مثلا حنفیہ کے ہاں کسی حدیث کے معنی کا اوفق بالقرآن ہونا اقوی وجوہ ترجیح میں سے ہے۔اگر چہ دوسری جانب زیادہ قوی یا عالی سند ہو، کیونکہ قرآن مجید کے الفاظ بعینہا محفوظ ہیں، برخلاف حدیث شریف کے، کہ روایت بالمعنی کے شیوع کی وجہ سے یقیناً نہیں کہہ سکتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی الفاظ ارشاد فرمائے ہوں، لہذا جو معانی الفاظ قرآن کے زیادہ قریب ہوں ان کا راجح ہونا بدیہی قطعی ہے ۔ (دیکھیے :اوجز المسالک :۹۵/۲، ۹۶، اختلاف ائمہ :ص۴۵، ۸۳، ۸۴، تقریر بخاری :۱۲۷/۱، ۱۲۸، حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ، انعام الباری :۱۱۷/۱- ۱۲۰) ایسے ہی شریعت کے قواعد کلیہ کے موافق ہونا بھی خبر واحد کے لیے بہت قوی وجہ ترجیح ہے۔(دیکھیے :درس ترمذی :۸۶/۱)

علوم الحدیث کی سب انواع کا ثمرہ دو چیزیں ہیں:

۱: یہ معلوم ہو جائے کہ حدیث ثابت ہے یا نہیں؟ اور ثبوت و عدم ثبوت کا کیا درجہ ہے؟۔

۲: حدیث کے معنی کیا ہیں؟۔حدیث کے ثبوت اور دلالت کی بحث میں محدثین کے ساتھ ساتھ فقہاء اور اصولیین کا کلام بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔اس کے بغیر سب پہلو واضح نہیں ہوتے۔

☆.....☆.....☆

گناہ اور معصیت!

مصائب وآفات اور پریشانیوں کا سبب

مولانا شفیق الرحمٰن علوی

مختلف انسان مختلف قسم کی پریشانیوں میں گرفتار وبتلا رہتے ہیں: کسی کو جانی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو کسی کو مالی، کسی کو منصب کی پریشانی ہوتی ہے تو کسی کو عزت وآبرو کی، امیر اپنی کوٹھی میں پریشان تو غریب جَھونپڑی میں، کوئی روزگار اور حالات سے نالاں تو کوئی عزیز واقارب اور دوست واحباب سے شاکی۔ تقریباً ہر آدمی کسی نہ کسی فکر، بے سکونی اور پریشانی میں مبتلا ہے۔

دلی سکون، قرار اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے ہر ایک اپنے ذہن اور اپنی سوچ کے مطابق اپنی پریشانیوں کی ازخود تشخیص کرکے ان کے علاج میں لگتا ہے۔ کوئی اقتدار، منصب یا عہدہ میں سکون تلاش کرتا ہے، مگر جب اُسے مطلوبہ منصب مل جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں تو سکون نام کی کوئی چیز ہی نہیں، بلکہ منصب کی ذمہ داریوں اور منصب کے زوال کے اندیشوں کی صورت میں اور زیادہ تفکرات ہیں۔

کسی نے سمجھا کہ سکون صرف مال ودولت کی کثرت وفراوانی میں ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو یہ مال ودولت حاصل ہوا، اُن میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ کاروباری تفکرات، ترقی کا شوق، دن بدن بڑھتی ہوئی حرص اور تجارت میں نقصان کے اندیشوں سے اُن کی راتوں کی نیند حرام ہے، الا ماشاء اللہ۔ کسی نے رقص وسرود اور شراب وکباب کو باعثِ سکون جانا، مگر وقتی اور عارضی لذت کے بعد پھر بھی بے چینی اور اضطراب برقرار۔ کسی نے منشیات کا سہارا لیا، مگر اس میں بھی صرف عارضی دل بہلاوا، عارضی فائدہ اور دائمی نقصان۔ کسی نے نت نئے فیشن کرکے دل بہلانے کی کوشش کی، مگر سکون وقرار نہ ملا۔

جبکہ ایک طبقہ (دینی ذہن رکھنے والوں) کا یہ خیال ہے کہ مختلف پریشانیوں اور مصیبتوں سے بچاؤ کا اصل طریقہ اور اُن کا حقیقی علاج صرف ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو گناہگار، خطاکار، نافرمان اور قصوروار سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے اور گناہوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کو راضی کرلیا جائے، کیونکہ سکون وراحت کے سب خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، وہی ان کا مالک ہے، جب مالک راضی ہوگا تو خوش ہوکر اپنی مملوکہ چیز (سکون وراحت) اپنے فرمانبردار بندوں کو عطا کرے گا اور وہ مالک راضی ہوتا ہے نافرمانی اور گناہوں کو چھوڑنے اور فرمانبرداری اختیار کرنے سے۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ ہر اچھے یا بُرے عمل کا ردِعمل ضرور ہوتا ہے، دنیا میں پیش آنے والے حالات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی چیز انسان کے اچھے یا بُرے اعمال ہیں جن کا براہِ راست تعلق اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ناراضی سے ہے۔ کسی واقعہ اور حادثہ کے طبعی اسباب جنہیں ہم دیکھتے، سُنتے اور محسوس کرتے ہیں، وہ کسی اچھے یا برے واقعہ کے لیے محض ظاہری سبب کے درجہ میں ہیں۔ سادہ لوح لوگ حوادث وآفات کو صرف طبعی اور ظاہری اسباب سے جوڑتے اور پھر اِسی اعتبار سے اُن حوادث سے بچاؤ کی تدابیر کرتے ہیں۔ شرعی تعلیمات کی روشنی میں بحیثیت مسلمان ہمیں یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور امر سے ہوتا ہے، جس کا عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ ادراک کرنے سے ہم قاصر ہیں، وحی الٰہی اور انبیاء کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جزاء وسزا کا جو نظام سمجھایا ہے، وہ ہمیں اس غیبی نظام کے بارے میں آگاہ کرتا ہے، وہ یہ کہ کسی بھی واقعہ اور حادثہ کا اصل اور حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حالات کو (خواہ اچھے ہوں یا بُرے) انسانی اعمال سے جوڑا اور وابستہ فرمایا ہے، چنانچہ انسان کے نیک وبد اعمال کی نوعیت کے اعتبار سے احوال مرتب ہوتے ہیں: صحت ومرض، نفع ونقصان، کامیابی وناکامی، خوشی وغمی، بارش وخشک سالی، مہنگائی وارزانی، بدامنی ودہشت گردی، وبائی امراض، زلزلہ، طوفان، سیلاب وغیرہ، وغیرہ، یہ سب ہمارے نیک وبد اعمال کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر: ان سب احوال کے ظاہری اسباب کچھ بھی ہوں، مگر حقیقی اسباب ہمارے نیک وبد اعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح کے خوفناک اور عبرت انگیز واقعات (خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی) دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''الارم'' اور ''تنبیہ'' ہوتے ہیں، تاکہ انسان اپنے اعمال کا محاسبہ کرے اور کوئی تنبیہ اس کے غفلت شعار دل کو جُنبش دینے میں کامیاب ہوجائے:

جب بھی میں کہتا ہوں: اے اللہ! میرا حال دیکھ، حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامہ اعمال دیکھ

دُنیا میں پیش آمدہ اچھے یا بُرے واقعات سے حاصل ہونے والا انسانی تجربہ بھی اسی پر شاہد ہے کہ بہت سارے لوگوں اور قوموں پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے دُنیا میں ہی مختلف قسم کے عذاب آئے ہیں، مثلاً: کوئی مسخ کیا گیا، کوئی زمین میں دھنسایا گیا، کوئی دریا میں غرق کیا گیا، کوئی طوفان کی نذر ہوا۔ ان تباہ شدہ اقوام کی بستیوں کے کھنڈرات آج بھی اس حقیقت پر دال ہیں کہ نافرمانی سببِ عذاب وپریشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیثِ مبارکہ میں اعمال کی حسبِ نوعیت تاثیرات کو (جیسی کرنی ویسی بھرنی کے بمصداق) مختلف پہلوؤں اور طریقوں سے بیان فرمایا ہے، امت کو بدعملیوں کے بُرے نتائج سے آگاہ فرما کر اعمال کی اصلاح کا حکم دیا ہے، چنانچہ یہ مضمون قرآن کریم کی دسیوں آیات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سینکڑوں احادیث سے صراحۃً

ثابت ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱:...''مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً''۔(النحل:۹۷)

ترجمہ:... ''جوکوئی نیک کام کرے گا،خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو،تو ہم اُسے پاکیزہ (یعنی عمدہ) زندگی دیں گے''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ نیکی پُرسکون زندگی کا سبب ہے، چنانچہ دو چیزوں (ایمان اور اعمال صالحہ) کے موجود ہونے پر اللہ تعالیٰ نے ''حٰیوۃ طیبۃ'' یعنی بالطف،عمدہ اور پُرسکون زندگی عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔ عام آدمی بھی یہ آیت پڑھ کر یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ نہ ہوں یا کوئی ایک نہ ہو تو ''حٰیوۃ طیّبۃ'' یعنی ''پُرسکون زندگی'' نصیب نہ ہوگی، بلکہ ''پریشان زندگی'' ہوگی۔

۲:... ''وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَإِنَّ لَهُ مَعِيْشَةً ضَنْكاً وَّنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمٰى''(طٰہٰ:۱۲۴)

ترجمہ:... ''اور جو شخص میرے ذکر (نصیحت) سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے (دنیا اور آخرت میں) تنگی کا جینا ہوگا''

مطلب یہ ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل نہ کی، بلکہ نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا کی زندگی تنگ کردیں گے،ظاہری طور پر مال و دولت،منصب و عزت مل بھی جائے تو قلب میں سکون نہیں آنے دیں گے،اس طور پر کہ ہر وقت دنیا کی حرص،ترقی کی فکر اور کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہے گا۔اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوا کہ ''نافرمانی سببِ پریشانی اور فرمانبرداری سببِ سکون ہے''۔

۳:...''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِى النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ''۔ (الروم:۴۱)

ترجمہ:... ''خشکی اور تری میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی (اعمال) کے سبب خرابی پھیل رہی ہے،تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کے بعض اعمال کا مزہ انہیں چکھادے،تاکہ وہ باز آجائیں''۔

۴:... ''وَمَآ أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ''۔(الشوریٰ:۳۰)

ترجمہ:... ''اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سارے (گناہوں) سے تو وہ (اللہ تعالیٰ) درگزر کردیتا ہے''۔

ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ مصیبت اور فساد کا سبب خود انسان کے اپنے کیے ہوئے بُرے اعمال ہیں،اور یہ بھی بآسانی سمجھ میں آرہا ہے کہ: اگر بُرے اعمال نہ ہوں تو یہ مصائب،آفات اور فسادات وغیرہ بھی نہ ہوں گے۔

نتیجہ یہی نکلا کہ ''نافرمانی سببِ پریشانی اور فرمانبرداری سببِ سکون ہے''۔

۵:... ''وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَأَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ''۔(الاعراف:۹۶)

ترجمہ:... ''اور اگر ان بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے، لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا''۔

یعنی ایمان اور تقویٰ (اعمالِ صالحہ) برکت وخوشحالی کا ذریعہ اور بُرے اعمال عذاب وپکڑ اور پریشانی کا سبب ہیں۔

۶:... ''وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَاتَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ''۔(ہود:۵۲)

ترجمہ:... ''اور اے میری قوم! تم اپنے گناہ اپنے رب سے معاف کراؤ اور اس کے سامنے توبہ کرو، وہ تم پر خوب بارش برسائے گا اور تم کو قوّت دے کر تمہاری قوّت میں زیادتی کرے گا اور مجرم رہ کر اعراض مت کرو''۔

۷:... ''فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ إِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا، يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا، وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهٰرًا''(نوح:۱۲)

ترجمہ:... ''تو میں نے کہا کہ: گناہ بخشواؤ اپنے رب سے، بے شک وہ بخشنے والا ہے، تم پر آسمان کی دھاریں (تیز بارشیں) برسائے گا اور بڑھادے گا تم کو مال اور بیٹوں سے اور بنادے گا تمہارے واسطے باغ اور بنادے گا تمہارے لیے نہریں''۔

ان دونوں آیات میں نعمتوں اور برکات کے حصول کا طریقہ گناہوں سے توبہ، استغفار اور تقویٰ کو بیان فرمایا ہے، جب معلوم ہوا کہ گناہوں کا چھوڑنا اور توبہ کرنا مال واولاد کی کثرت اور خوشحالی کا سبب ہے تو اس سے لازمی طور صاحبِ عقل وشعور یہی نتیجہ نکالے گا کہ ''گناہ اور نافرمانی، نعمتوں میں کمی اور بدحالی کا سبب ہے''۔

۸:... ''وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا، وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَايَحْتَسِبُ''۔(الطلاق:۲،۳)

ترجمہ:... ''اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے، جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا''۔

اس آیت میں تقویٰ کو نجات اور وسعتِ رزق کا سبب بتایا ہے اور اس کا عکس یہی ہے کہ نافرمانی اور گناہ پریشانیوں میں گرفتار ہونے اور قلتِ رزق اور نعمت میں کمی کا سبب ہے۔

۹:... ''وَضَـرَبَ اللّٰـهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ''۔(النحل:۱۱۲)

ترجمہ:... ''اور بتائی اللہ نے ایک بستی کی مثال جو چین وامن سے تھے، چلی آتی تھی اس کی روزی فراغت سے ہر جگہ سے، پھر ناشکری کی اللہ کی نعمتوں کی، پھر مزہ چکھایا اس کو اللہ نے بھوک اور خوف کے لباس کا''۔

اگر غور کیا جائے تو یہ آیت درحقیقت ایک آئینہ ہے، جس میں ہر بستی اور ہر ملک والے اپنی حالت دیکھ اور جانچ سکتے ہیں۔ جس کی حالت اس بستی کی طرح ہے، وہ سمجھ لے کہ اُس سے غلطی بھی اُنہیں کی طرح ہوئی ہے۔ اپنے ملک کے موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے آیت کے ترجمہ کو دوبارہ پڑھیں اور غور کریں تو صاف پتہ چلے گا کہ ہم میں اور ان بستی والوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے اسلامی ملک پاکستان کے ساتھ مسلمانانِ پاکستان نے جو غیر اسلامی سلوک روا رکھا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری ہے، جس کے نتیجہ میں ہم پر آج برے حالات مسلط ہیں۔ ہمارے وطنِ عزیز ملک پاکستان کے منجملہ بڑے مسائل میں سے دو مسئلے بہت خطرناک اور انتہائی پریشان کن ہیں۔ ۱:... مہنگائی۔ ۲:... بدامنی اور دہشت گردی۔ اس آیت میں بھی ناشکری کی دو سزائیں مذکور ہیں، ہم نے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری اور اُس کی نافرمانی کی ہے، اس لیے ہم ان حالات کا شکار ہیں۔ بہرحال قرآن مجید کی یہ آیت ٹھیک ٹھیک ہمارے حالات پر چسپاں ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔

بہت سی احادیث بھی صراحۃً اسی مضمون ''نافرمانی سببِ پریشانی اور فرمانبرداری سببِ سکون'' پر دلالت کرتی ہیں۔ ''مشتے نمونہ از خروارے'' یہاں چند احادیث پیش کی جاتی ہیں، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس وقت کیا ہوگا؟ جب پانچ چیزیں تم میں پیدا ہو جائیں گی اور میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تم میں پیدا ہوں یا تم ان (پانچ چیزوں) کو پاؤ، (وہ یہ ہیں):۱:... بے حیائی: جسے کسی قوم میں علانیہ (ظاہراً) کیا جاتا ہو تو اس میں طاعون اور وہ بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جو ان سے پہلوؤں میں نہیں تھیں۔ ۲:... اور جو قوم زکوٰۃ سے رک جاتی ہے تو وہ (درحقیقت) آسمان سے ہونے والی بارش کو روکتی ہے اور اگر جانور نہ ہوتے تو ان پر بارش برستی ہی نہیں۔ ۳:... اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو وہ قحط سالی، رزق کی تنگی اور بادشاہوں کے ظلم میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ۴:... اور امراء جب اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے بغیر فیصلے کرتے ہیں تو ان پر دشمن مسلط ہو جاتا ہے جو ان سے ان کی بعض چیزوں کو چھین لیتا ہے۔ ۵:... اور جب اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑتے ہیں

تو اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں جھگڑے پیدا کر دیتا ہے''۔(الترغیب، ج:۳،ص:۱۶۹)

مذکورہ حدیث میں مختلف گناہوں کو مختلف آفات و پریشانیوں کا سبب بتایا گیا ہے، اس قدر صراحت کے بعد بھی کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ: ''نافرمانی سببِ پریشانی وعذاب ہے''؟۔

ایک اور روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''**عبادَ اللّٰہ! لَتُسَوُّنَّ صفوفَکم أو لیخالفَنَّ اللّٰہُ بین وجوھکم**۔'' (مشکوٰۃ،ص:۹۷)

ترجمہ:... ''اے اللہ کے بندو! تم اپنی صفوں کو درست کرلو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں (یعنی دلوں) میں اختلاف پیدا کردے گا''۔

مذکورہ حدیث میں صفوں کو سیدھا نہ کرنے کے فعل بد پر (جو ہے بھی بظاہر چھوٹا گناہ) آپس میں اختلافات پیدا ہونے کی وعید ہے، اس سے واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ بُرے اعمال سبب پریشانی ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ایک حدیث میں ہے کہ:

''**اَعمالکم عمالکم و کما تکونوا یولی علیکم**''۔(کشف الخفاء ج:۱،ص:۱۴۷، بحوالہ طبرانی)

ترجمہ:... ''تمہارے اعمال ہی (درحقیقت) تمہارے حاکم ہیں اور جیسے تم ہوگے ایسے ہی حاکم تم پر مسلّط ہوں گے''۔

یہ حدیث بھی اعمالِ بد کے برے نتائج برآمد ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ برے اور ظالم حکمران بھی اعمالِ بد کی وجہ سے مسلط ہوتے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہاں ذکر کر دیا جائے، جو مذکورہ مسئلہ پر دلالت کرتا ہے: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک دفعہ مدینہ اور حجاز کے علاقہ میں زبردست قحط پڑا، حضرت عمرؓ نے مصر و شام کے علاقہ سے کثیر مقدار میں غذائی اشیا منگوائیں، مگر قحط کسی طور پر کم نہ ہوا، ایک صحابی بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ کو خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو سمجھتا تھا کہ عمرؓ سمجھدار آدمی ہے! اس صحابیؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خواب سنایا، حضرت عمرؓ بہت پریشان ہوئے اور نمازِ فجر کے بعد صحابہ سے دریافت کیا کہ کیا تم لوگوں نے میرے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی تبدیلی محسوس کی؟ صحابہ نے کہا: نہیں اور حضرت عمر کی کچھ تعریف کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھنے والے صحابیؓ کو فرمایا کہ اپنا خواب بیان کریں۔ خواب سن کر صحابہ نے فرمایا: امیر المؤمنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جانب متوجہ فرما رہے ہیں کہ قحط کے حالات سے نمٹنے کے لیے آپ دنیا کے ظاہری اسباب تو اختیار فرما رہے ہیں،

لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ سے رجوع نہیں کیا، یعنی نمازِ استسقاء نہیں پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ حق قبول کرنے کا مزاج رکھتے تھے تو آپؓ نے نمازِ استسقاء ادا فرمائی اور ایسی بارش ہوئی کہ مدینہ کا طویل قحط دور ہوا۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۷، ص:۲۰۳، ۲۰۴)

اس واقعہ پر غور کرنے سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ اچھے اعمال کا اثر بھی اچھا اور بُرے اعمال کا اثر بھی بُرا ہوتا ہے، جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں نمازِ استسقاء (جو نیک عمل ہے) کا اثر اچھا ہوا۔ اور اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسائل صرف ظاہری اسباب سے حل نہیں ہوتے، بلکہ ان کے لیے باطنی اسباب بھی ضروری ہوتے ہیں۔

ممکن ہے کسی کو یہ تردّد اور اشکال ہو کہ عجیب بات ہے، پریشانی دنیوی ہے اور مشورہ دنیوی اسباب کے بجائے گناہوں اور نافرمانیوں کے چھوڑنے کا دیا جارہا ہے، یعنی بظاہر ان دونوں باتوں کا آپس میں کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔

اس اعتراض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہوں کو پریشانی اور نیکی کو راحت واطمینان کا سبب قرار دے دیا تو ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ عقل میں آئے یا نہ آئے، بلاتردُّد ''اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا'' کہے اور بزبانِ حال یوں گویا ہو کہ:

''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے''

کیونکہ جس ذات پر ایمان لائے ہیں، اس کا یہی فرمان ہے، اس لیے ماننے کے سوا چارہ کار نہیں۔

دوسرا جواب عقلی لحاظ سے یہ ہے کہ مال ودولت، عزت ومنصب، صحت وتندرستی، راحت وسکون وغیرہ، یعنی دنیا کی ہر نعمت اللہ تعالیٰ کے خزانہ اور ملکیت میں ہے، جب ہر نعمت اللہ تعالیٰ کے خزانہ اور ملکیت میں ہے تو پھر سوچئے کہ کیا مالک (اللہ تعالیٰ) جس کے دربار میں نہ ہی چوری ممکن ہے اور نہ زبردستی سفارش، اس کو راضی کیے بغیر کچھ لیا جاسکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرکے ہی پریشانیوں سے چھٹکارا اور راحت وسکون مل سکتا ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں: بعض اوقات نیک وصالح، دین دار، حتیٰ کہ بزرگ حضرات بھی مصیبت وپریشانی میں مبتلا ہوجاتے ہیں، حالانکہ وہ گناہوں سے بھی بچ رہے ہوتے ہیں، فرمانبرداری بھی کررہے ہوتے ہیں، ایسا کیوں ہے؟۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ قاعدہ اکثریہ ہے یعنی اکثر پریشانیاں گناہوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے آتی ہیں، مگر بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو بطورِ آزمائش ہوتی ہیں اور نتیجۃً نعمت کے حصول کا سبب بنتی ہیں، وہ اس طرح کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے کو کسی خاص اخروی درجہ اور مرتبہ پر فائز کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ اپنی بشری کمزوری کی وجہ سے نیکیوں کی بنیاد پر اُس کا مستحق نہیں بن سکتا تو اللہ تعالیٰ اُس کے مرتبہ کو مزید بڑھانے اور اونچا کرنے کے لیے

دنیا کے اندر آزمائش (بیماری، پریشانی وغیرہ) میں مبتلا کردیتے ہیں تو یہ مصیبت درحقیقت مصیبت نہیں ہوتی، بلکہ ایک طرح کی نعمت ہوتی ہے جو نتیجۃً رفعِ درجات کا سبب بنتی ہے، انبیاء علیہم السلام کی تکالیف اور آزمائشیں اسی قبیل سے ہیں، ان کی مثال اُس محنت کی طرح ہے جو کسی نعمت کے حصول میں کرنی پڑتی ہے، جیسے شہد کے حصول میں بعض اوقات شہد کی مکھی کے ڈنک سہنے پڑتے ہیں، تو اس طرح کی پریشانیاں دراصل شہد کی مکھی کے اُن ڈنکوں کی طرح ہیں جو بالآخر شہد جیسی نعمت کے حصول پر منتج ہوتے ہیں۔

اس شبہ کا دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس نیک بندے سے بشری کمزوری کی بنا پر کبھی کوئی گناہ سرزد ہوجاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جو بڑے رحیم وکریم ہیں، اپنے خاص بندے کے اس گناہ کو دنیا ہی میں دھونے کے لیے اُسے مصیبت میں مبتلا کردیتے ہیں، تاکہ وہ آخرت کی بڑی رُسوائی اور بڑے عذاب سے بچ جائے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ایک صورت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ انسان نہیں کرسکتا۔

ان دو جوابات کا حاصل یہ ہے کہ انسان پر آنے والی پریشانی دو قسم کی ہوتی ہے: ایک پریشانی وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوتا ہے، جو اخروی عذاب کی ایک جھلک ہوتی ہے۔ اصل دارالجزاء تو آخرت ہے، دنیا دارالعمل ہے، مگر کبھی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے اخروی عذاب کا ایک ادنیٰ سا نمونہ دنیا میں بھی دکھادیتا ہے، تاکہ انسان نافرمانی سے باز آجائے، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔'' (السجدۃ:۲۱)

''اور ہم ضرور ان کو قریب کا چھوٹا عذاب چکھائیں گے بڑے عذاب سے پہلے، تاکہ وہ لوٹ آئیں۔''

اور پریشانی کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کا عذاب نہیں ہوتی، بلکہ اس کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے جو رفع درجات یا گناہوں کے مٹنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اور یہ پریشانی اور تکلیف درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہوتی ہے کہ اس چھوٹی سے تکلیف کے سبب اللہ تعالیٰ اپنے کمزور بندے کو آخرت کے بڑے عذاب سے بچالیتے ہیں یا رفع درجات کی صورت میں آخرت کی بڑی نعمت عطا فرمادیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک حدیث میں ہے کہ:

''**اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل۔**''

''سب سے زیادہ آزمائش انبیاء علیہم السلام پر آتی ہے، پھر جو اُن کے جس قدر زیادہ مشابہ ہو۔''

یعنی انبیاء علیہم السلام پر زیادہ آزمائشیں آئیں اور پھر جس کا جس قدر اُن سے زیادہ تعلق ہوگا، زیادہ قرب ہوگا، زیادہ اتباع ہوگی، اس پر بھی آزمائشیں زیادہ آئیں گی، مگر خدانخواستہ انبیاء علیہم السلام پر آنے والی یہ تکالیف اور آزمائشیں کوئی سزا نہیں تھیں، بلکہ ان کے درجات کو مزید بلند کرنا مقصد تھا۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ نافرمان لوگ جو مال دار ہیں، بظاہر خوش نظر آتے ہیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے کہ مالداری ایک نعمت ہے اور خوشی اور آرام کا ظاہری سبب ہے، مگر ضروری نہیں کہ جو مال دار ہو، وہ خوشحال اور پرسکون بھی ہو، کیونکہ بعض لوگوں کے پاس بظاہر مال و دولت اور سامانِ عیش وعشرت تو ہوتا ہے، مگر ان کا دل قناعت وتوکل سے خالی ہونے کی بنا پر ہر وقت دنیا کی مزید حرص، ترقی کی فکر، اور کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہتا ہے، ذرا اُن سے پوچھ کر تو دیکھئے کہ وہ راحت وآرام کے سارے اسباب اپنے پاس رکھنے کے باوجود سکونِ دل کی دولت سے کتنے محروم ہیں؟ ہاں! اگر کوئی ایک آدھ فرد ایسا مل جائے جو نافرمان ہونے کے باوجود بھی خوش ہو تو وہ شاذ ونادر مثال ہوگی اور شاذ ونادر کا اعتبار نہیں ہوتا، حکم اکثریت پر لگتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ نافرمانوں کی اکثریت پریشان ہی رہتی ہے۔ دراصل قلبی سکون اور حقیقی اطمینان مال سے حاصل ہونے والی چیز ہی نہیں ہے، اس کا تعلّق اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کے ذکر سے ہے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: ''أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ'' یعنی ''خبردار اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ہوتا ہے''۔ مگر ہم میں سے اکثر لوگ چونکہ ذکر اللہ کی لذت سے بالکل کورے ہیں، اس لیے ہمیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا، دراصل ہم نے اس وادی میں قدم ہی نہیں رکھا، بقولِ شاعر:

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

مذکورہ اعتراض کا یہ جواب بھی ہے کہ جو نافرمان بظاہر خوشحال ہیں، انہیں دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہے، جو چند روزہ ہے، یہ چند روزہ خوشحالی لمبی پریشانی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جس خوشحالی کا انجام چند روز کے بعد دائمی تباہی ہو، اسے خوشحالی کہنا کہاں زیبا ہے؟ جیسے چوہا زہر ملی ہوئی چیز کھا کر خوش ہوتا ہے، مگر اس میں اس کی تباہی پوشیدہ ہوتی ہے۔

اصل نکتہ کی بات یہ ہے کہ سکون وراحت کا تعلّق صرف جسم سے نہیں ہے، بلکہ جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی ان کا تقاضہ کرتی ہے، مادی وسائل اور راحت وسکون کے ظاہری اسباب جسم کو تو آرام دے سکتے ہیں، مگر روح کو قرار اور دل کو سکون بخشنا اُن کے بس کی بات نہیں۔

روح کی تسکین اور اس کی غذا عبادت اور ذکر اللہ ہیں، کیونکہ انسان کی فطری خواہش ہے کہ وہ کسی لافانی ذات کی بندگی کرے، اس فطری خواہش کی تسکین مادہ پرست زندگی کے اسباب ووسائل سے پوری نہیں ہوسکتی، روح کی تسکین کے لیے روحانی اسباب (اعمال صالحہ جیسے ذکر اللہ اور عبادت وغیرہ) کا اختیار کرنا ضروری ہے۔

(باقی صفحہ نمبر:۱۲)

دعا ایک نادیدہ خزانہ ہے

مولانا محمد ابرار کلیم القاسمی

دعا ایک عظیم نعمت اور انمول تحفہ ہے، اس دنیا میں کوئی بھی انسان کسی بھی حال میں دعا سے مستغنی نہیں ہوسکتا، دعا اللہ کی عبادت ہے، دعا اللہ کے متقی بندے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے اوصافِ حمیدہ میں سے ایک ممتاز وصف ہے، دعا اللہ تعالی کے دربارِ عالیہ میں سب سے باعزت تحفہ ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَيْسَ شَيْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ عَزّ وَجَلّ مِنَ الدُّعاء (دعا سے بڑھ کر اللہ تعالی کے یہاں کوئی چیز باعزت نہیں) دعا اللہ تعالی کے یہاں بہت پسندیدہ عمل ہے، سَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِه فَانّه يُحِبُّ أنْ يُسْأَلَ (اللہ سے اس کا فضل مانگو کیوں کہ وہ اپنے سے مانگنے کو پسند کرتا ہے) دعا شرحِ صدر کا سبب ہے، دعا سے اللہ تعالی کے غصہ کی آگ مدھم پڑتی ہے، دعا آفت ومصیبت کی روک تھام کا مضبوط وسیلہ ہے، بلاشبہ دعا اپنی اثر انگیزی اور تاثیر کے لحاظ سے مومن کا ہتھیار ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلدُّعَاءُ سِلاَحُ الْمُؤمِنِ وَعِمَادُ الدِّيْنِ وَنُوْرُ السّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ .....دعا مومن کا ہتھیار، دین کا ستون اور آسمان وزمین کی روشنی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعا کی تاکید کی ہے، اس کی قبولیت کا وعدہ کیا ہے نیز اس پر انبیاء کرام علیہم السلام اور رسولوں کی تعریف کی ہے، اللہ کا ارشاد ہے: إنّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِيْ الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِيْن ..... بے شک وہ سب نیک کاموں میں جلدی کرنے والے تھے اور وہ ہمیں امید اور خوف سے پکارتے تھے اور وہ ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔'' اللہ تعالی نے قرآن مجید میں صاف صاف اعلان کیا: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّي قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدّاعِ إِذَا دَعَانِ (جب میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں، تو میں قریب ہوں، دعا کرنے والا جب مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں) یقیناً یہ اللہ کا فضل اور کرم ہی ہے کہ بندوں کے ہر عمل سے بے نیازی کے باوجود وہ اپنے ہی سے مانگنے کا حکم کرتا ہے: يَاأَيُّهَا النّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْد (اے لوگو، تم اللہ تعالی کے محتاج ہو اور اللہ تعالیٰ بے نیاز، بڑی تعریف والا ہے) سورہ فاطر میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (اللہ تعالی بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو) حدیثِ قدسی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلّاَ مَنْ هَدَيْتُه فَاسْتَهْدُوْنِیْ اَهْدِكُمْ يَا عِبَادِیْ، كُلُّكُمْ جَائِعٌ اِلّاَ مَنْ أَطْعَمْتُه فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ اُطْعِمْكُمْ، يَا عِبَادِیْ اِنَّكُمْ تَخْطَئُوْنَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَأَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ اَغْفِرْلَكُمْ

''اے میرے بندے! تم بے راہ ہو؛ جب تک میں تمہیں ہدایت نہ دوں، لہٰذا تم مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں تمہیں ہدایت دوں گا، اے میرے بندے تم سب بھوکے ہو، سوائے اس شخص کے جسے میں کھلاؤں، لہٰذا تم مجھ سے کھانا مانگو میں تمہیں کھلاؤں گا، اے میرے بندے، تم رات اور دن غلطیوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخشنے والا ہوں، لہٰذا تم مجھ سے مغفرت طلب کرو، میں بخشش کرنے والا ہوں۔''

لہٰذا دعا کا حیاتِ انسانی سے گہرا تعلق ہے اور اپنے اثرات کے لحاظ سے ایک مسلمہ تاریخ ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ خوشحالی ہو یا بدحالی ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہیے، اللہ تعالیٰ دونوں حالتوں میں یاد کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور اس کو نوازتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء ہیں اور احترام واکرام کے بلند وبالا مقام پر فائز ہیں، ان کی دعا کی قبولیت نے روئے زمین پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کے لیے امن اور پھلوں کا رزق ساتھ ہی باشندگان عالم کے قلوب کا التفات مانگا کہ اے ہمارے رب، بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بغیر کھیتی والے میدان میں بسایا ہے تیرے احترام والے گھر کے نزدیک، اے ہمارے رب؛ تاکہ وہ نماز قائم کریں، پس لوگوں کے دلوں کو ایسا کردے کہ ان کی طرف مائل ہوں، اور انھیں پھلوں سے رزق دے؛ تاکہ وہ شکر کریں) انھیں سب سے نوازا گیا، آپ نے ہونہار وسعادت مند فرزند کے ہمراہ کعبہ کی دیوار بنائیں تو دعا کی: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِه وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کہ ان کی نسل میں ایک بہترین امت وجود میں آئے، جس میں ایک رسول مبعوث ہو جو انھیں کلامِ الٰہی کی تعلیم دے، اس میں موجود حکمت کی باتوں سے انھیں روشناس کرائے اور ان کی زندگیاں سنوارے، اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کی دعا قبول کی اور اس کرہ ارضی پر امت مسلمہ خیر کے ساتھ نمودار ہوئی، جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا، اس امت کو خیر امت کے لقب سے نوازا گیا، اس امت کا وجود کائناتِ عالم کے لیے پیغامِ خیر ہے، اس کا نبی رحمۃ للعالمین ہے، جس کے فرمان لوگوں کے قلوب پر اور جن کا نقوشِ پا زمانے کے ریگستانوں پر یوں ثبت ہوئے ہیں کہ وقت کی تیز وتند ہوا اور خطرناک آندھیاں انھیں مدھم نہ کرسکیں، تاریخی حیثیت سے فتنہ تاتار ان نقوش کو مدھم کرتے کرتے خود بجھ گیا اور دنیا نے یہ منظر دیکھا کہ:

''پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے''

بقول کسے: دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا ابدی انداز ملاحظہ ہو، دن بہ دن رفع ذکر کے سامان ہوتے چلے جارہے ہیں اور اقراء کی ضیا پاشیوں میں اپنی منازل طے کرتا چلا جارہا ہے۔

دعا انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقدیر بدل گئی اور اسلام کے صفحہء اول میں داخل ہو گئے، اَللّٰھُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِاَحَدِ الْعُمَرَیْنِ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ أَوْ عُمَرَ بْنَ ھِشَامٍ (اے اللہ عمرین عمر بن خطاب یا عمر بن ہشام میں سے کسے ایک ذریعہ اسلام کو تقویت عطا کر) بدر کے سنگلاخ میدان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا نے جبرئیلِ امین کو لا کھڑا کیا اور شیطان کو شکست کھانی پڑی، اُحد میں فتح کے بعد فاتحِ لشکر کو مدینہ منورہ کے دروازے پر دستک دینے کی ہمت نہ ہوئی؛ حالاں کہ ظاہری اعتبار سے اب کوئی رکاوٹ نہ تھی اور کوئی رکاوٹ تھی تو وہ نالہء نیم شب کی اثر انگیزی تھی کہ وہ بدقسمت لشکر مدینہ کے بجائے مکہ روانہ کر دیا گیا، جنگِ خندق میں دعاؤں نے افواج عرب کو ہواؤں اور ان دیکھے لشکروں کے ذریعے پسپا کر دیا، جنگ یرموک میں بھی وہی ہواؤں کا ریلا مدد کو موجود تھا، اسی طرح قادسیہ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی پشت پر ایرانیوں کے خلاف وہ تیز وتند ہواؤں کا لشکر موجود تھا۔

یقیناً دعا مومن کا ہتھیار ہے، ربِ کریم کے نادیدہ خزانوں کی چابی ہے، دعا مومن کا بہت اہم خزانہ ہے، دعا عبادت کا مغز ہے (الدعاء مخ العبادۃ) لیکن اس کی حقیقت عقلیت پسندوں کی سمجھ میں نہیں آتی؛ جب کہ یہ تو جبلِ ہمالیہ سے کہیں بڑھ کر ٹھوس اور باوزن ہے اور بدیہی اعتبار سے ثابت بھی ہے، اللہ تعالی کے نادیدہ خزانوں کی چابی ہے، دعا مومن کا بہت اہم خزانہ ہے، دعا عبادت کا مغز ہے (الدعاء مخ العبادۃ) لیکن اس کی حقیقت عقلیت پسندوں کی سمجھ میں نہیں آتی؛ جب کہ یہ تو جبلِ ہمالیہ سے کہیں بڑھ کر ٹھوس اور باوزن ہے اور بدیہی اعتبار سے ثابت بھی ہے، اللہ تعالی کے نادیدہ خزانوں کا عظیم وعمیق ربط دعا سے ہے، جس کی قبولیت کے مختلف انداز ہیں، کبھی بعینہ وہی مل جائے، یا اس کا بدل؛ بل کہ نعم البدل مل جائے، جوں کا توں قبول نہ ہو؛ بل کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں اور وہ انسان کے انجام سے بخوبی واقف ہے؛ چناں چہ اس کے ذریعہ کوئی مصیبت دور کر دے، یا یہ کہ اسے مومن کے لیے بطور توشہء آخرت محفوظ کر دیا جائے؛ لیکن دعا کی قبولیت کے ان گوناگوں انداز کو عقلیت پسند ذہن تمسخر کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے؛ لیکن انھیں یہ پتا ہونا چاہیے کہ پُرخلوص کوشش اور دعا سے وہ نتائج نکلتے ہیں جن کی عقلی لحاظ سے بالکل امید نہیں ہوتی۔

دعا کی قبولیت کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ انسان اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کرے خوب خوب بندگی

کرے،تقوی اور پرہیزگاری کی راہ اور روش اپنائے یقیناً دعا میں تقوی کَالْمِلْحِ فِی الطَّعَامِ کا درجہ رکھتا ہے،جس کے بارے میں کسی نے لکھا ہے کہ:

یہ مخصوص اوقات میں محدود مقامات پر ایک خاص قسم کی پرتکلف کیفیت پیدا کرنے کا نام نہیں ہے؛ بل کہ یہ خشیتِ الٰہی سے عبارت ہے اگر تقوی اور پرہیزگاری کی روح نہ رہے تو انسان کی زندگی میں امن وسکون عنقا ہو جاتا ہے اور پھر یہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہوکر اپنی ناکامی اور نامرادی کا نوشتۂ تقدیر خود اپنے ہاتھوں تیار کر لیتا ہے،تقوی تو یہ ہے کہ کبر ونخوت اور غرور وسرکشی سے عاری اور تواضع وانکساری کے جذبات سے سرشار ہو،جس کے لیے خدا کی عطا کردہ نوازش کا احساس اور خالقِ دوجہاں کے منبعِ علم ہونے کا ایمان مہمیز کرتا ہے۔

اسی طرح جو بھی صلاحیت،لیاقت اور توانائیاں ہوں وہ راہِ خدا میں کھپادے، پھر اللہ تعالی سے نصرت واعانت اور سرخروئی وفتح وکامرانی کی دعا کرے،اللہ تعالیٰ کو تو پرخلوص جدوجہد اور صرف اسی پر توکل کرنا اور اسی سے مانگنا محبوب ہے،اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کو فاتح اور غالب کرنے وعدہ کیا ہے خواہ تعداد میں تھوڑے ہوں اور وسائل کی قلت ہو بقول علامہ اقبال:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے　　دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کردے

دعا کی قبولیت میں بے شمار موانع ہیں،مثال کے طور پر حرام کھانا،حرام پینا اور حرام لباس زیب تن کرنا،اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: اَلرَّجُلُ یُطِیْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ أَغْبَرَ، یَمُدُّ یَدَہ الٰی السَّمَاءِ، یَارَبِّ، یَارَبِّ، وَمَطْعَمُہ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُہ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُہ حَرَامٌ، وَغُذِیَ بِالْحَرَامِ، فَأَنّٰی یُسْتَجَابُ لَہ؟ (آدمی لمبا لمبا سفر کرے گا، پراگندہ حال،غبار آلود معلوم ہوگا، وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے گا، یارب یارب (کہے گا) اور اس کا کھانا حرام،اس کا پینا حرام،اس کا لباس حرام اور اس کی پرورش حرام غذا سے ہوئی ہو تو اس کی دعا کہاں سے قبول کی جائے گی؟) ایک دوسری حدیث میں ہے:اَطِبْ مَطْعَمَکَ تَکُنْ مُجَابَ الدَّعْوَۃِ (اپنے کھانے کو عمدہ کرو۔حلال کھانا کھاؤ۔تمہاری دعا قبول کی جائے گی)۔

دوسری چیز جو موانعِ دعا میں سے ہے وہ اخلاص کی کمی ہے؛اس لیے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: فَادْعُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ (پس اللہ تعالی کو پکارو،اسی کے لیے عبادت کو خالص کرتے ہوئے) ایک دوسری آیت اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:فَلَاتَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ أَحَدًا (اللہ تعالی کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تَعَرَّفْ إِلَی اللّٰہِ فِیْ الرَّخَاءِ یَعْرِفْکَ فِی الشِّدَّۃِ (اللہ تعالیٰ کو خوش حالی میں یاد کرو اللہ تعالیٰ تم کو سختی میں یاد کرے گا) یعنی یہ کہ جب بندہ اللہ تعالی سے ڈرتا ہے،اس کے حدود کی پاسداری کرتا ہے اور

خوش حالی میں اس کے حقوق کی رعایت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اسے معرفتِ خداوندی حاصل ہو جائے گی اور اللہ تعالی اس کو سختیوں سے بچائے رکھے گا اور حدیث میں ہے: بندہ مجھ سے نوافل کے ذریعہ قربت حاصل کرتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں، لہٰذا جب میں اسے محبوب سمجھتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ کچھ مانگتا ہے تو میں اس کو ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں (بخاری شریف)۔

اللہ تعالی غافل کی دعا قبول نہیں کرتا ہے؛ چنانچہ مستدرکِ حاکم میں مروی ہے کہ: اُدْعُوا اللّٰہَ وَأَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالإِجَابَةِ (اللہ تعالی سے دعا کرو اور قبولیت کا یقین رکھو) یعنی اللہ تعالی غافل اور لاپرواہ دل سے نکلی ہوئی دعا کو قبول نہیں کرتا ہے۔

دعا عبادت ہے، نجات کا ذریعہ ہے، لہٰذا جو بھی دعا سے اعراض کرے، اللہ سے نہ مانگے اللہ ان سے ناراض ہوتا ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ انّ الّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنّمَ دَاخِرِیْنَ لیکن اس کے برعکس جو خوب اللہ تعالی سے مانگے گا اس کے سامنے آہ وفغاں اور خشوع وخضوع کرے گا وہ اس دعا کی وجہ سے جنت میں داخل کیا جائے گا، جیسا کہ قرآن میں ہے: اور ان میں سے ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوگا آپس میں پوچھتے ہوئے وہ کہیں گے بے شک ہم اس سے پہلے اپنے اہلِ خانہ میں ڈرتے تھے تو اللہ تعالی نے ہم احسان کیا اور گرم ہوا کے عذاب سے بچالیا، بے شک وہ بہت ہی احسان کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اُدْعُوْا رَبّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفْیَةً انّه لایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ وَلاَ تُفْسِدُوْا فِی الْأَرْضِ بَعْدَ اصْلاَحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَطَمَعًا انّ رَحْمَتَ اللهِ قَرِیْبٌ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ (اپنے رب کو پکارو گڑگڑا کر اور آہستہ سے، بے شک وہ حد سے گزرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور فساد نہ مچاؤ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد، اور اسے پکارو ڈرتے اور امید رکھتے ہوئے، بے شک اللہ تعالی کی رحمت قریب ہے نیکی کرنے والوں سے) بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت قریب ہے فَلاَ تَیْأَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰہِ لہٰذا اسی سے سب کچھ ہونے کی لو لگائیں، وہی حاجت روا مشکل کشا ہے، اس کی رحمت سے کبھی بھی مایوس نہ ہوں اور ہر لمحہ، ہر پل اسی سے مانگیں، وہ بہت نوازنے والا اور خوب دینے والا ہے۔

☆.....☆.....☆

سوشل میڈیا اور ہمارا طرزِ عمل

مولانا مفتی شمس الدین

یہ بات مسلّم ہے کہ ہر چیز کے دو پہلو اور دو رخ ہوتے ہیں، ایک فائدہ کا پہلو اور دوسرا نقصان کا پہلو، جس چیز کو جس مقصد کے لیے ایجاد کیا گیا ہے، اگر وہ مقصد صحیح ہے اور اسے اسی مقصد میں استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے بے شمار فوائد وجود میں آتے ہیں اور اگر اس کا استعمال غلط ہوتا ہے تو پھر اس کے نقصانات اس کے فوائد پر غالب آجاتے ہیں، اور وہ چیز اپنی اصل منفعت کھو بیٹھتی ہے، دور حاضر میں ''سوشل میڈیا'' کی اہمیت اور ضرورت کا کوئی منکر نہیں ہے، ای میل (E-mail) وہاٹس اپ، ٹیلی گرام، فیس بک، انسٹا گرام، یوٹیوب اور دیگر سوشل میڈیا کے ذرائع کو استعمال کر کے کوئی بھی شخص یا ادارہ اپنی بات کو جلدی آسان اور موثر طریقہ سے دوسرے کے پاس پہنچا سکتا ہے۔ ان ذرائع کے جہاں زبردست فائدے ہیں، دوسری طرف ان کے غلط استعمال سے ان کے نقصانات بھی انتہائی خطرناک ہیں، اس دور میں سوشل میڈیا کا استعمال فوائد کی بجائے نقصانات میں زیادہ ہو رہا ہے، اگر کچھ لوگ اسے اچھے کام میں استعمال کر رہے ہیں تو دوسری طرف اکثر لوگ جو غیر ذمہ دار، سنجیدگی سے عاری اور نقصانات سے بے پروا ہیں، بلا تصدیق وتحقیق دینی اور دنیوی باتوں کو پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بلا تحقیق ایسی کسی بھی بات کا دوسروں تک پہنچانا جس سے معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہوں قانوناً اور شرعاً جرم ہے۔ اس وقت سوشل میڈیا پر ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو یا تو خود اپنی طرف سے باتوں کو یا پھر آئے ہوئے میسیج کو بلا تحقیق دوسروں تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ اس طرح جھوٹ پر مبنی جعلی باتیں اور میسجز منٹوں میں ہزاروں لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی بندۂ خدا اس کی تحقیق کی فکر نہیں کرتا، اس طرح پہلے شخص سے لے کر آخری شخص تک اور نہ جانے یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا، سب کے سب جھوٹی خبر کے پھیلانے کے جرم میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔

سوشل میڈیا کے ذریعہ جہاں سیاسی، سماجی، ملکی اور شخصی حالات بلا تحقیق وتصدیق پھیلائے جا رہے ہیں وہیں بے سند دینی اور مذہبی باتوں کو پھیلانے کا بھی ایک سلسلہ چل پڑا ہے، آئے دن موضوع اور انتہائی ضعیف اور گھڑی ہوئی احادیث وواقعات اور باتیں پھیلائی جا رہی ہیں اور دینی عنوان سے جس کے پاس بھی میسیج آتا ہے وہ یہ سمجھ لیتا ہے

کہ گویا اس کے پاس نیکیوں کا ایک خزانہ آ گیا ہے، اس کی تحقیق درکنار اسے مکمل پڑھتا بھی نہیں، بغیر پڑھے ہی چند لمحوں میں سیکڑوں اور ہزاروں لوگوں تک اسے پہنچا دیتا ہے اور اس کے بعد اپنے عمل سے خوش ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے بہت بڑا کار خیر کر کے نیکیوں کا ذخیرہ اکٹھا کر لیا؛ حالانکہ وہ اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ اس نے جھوٹی اور غلط بات پھیلا کر اپنے گناہوں میں اضافہ کر لیا ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا. (سورة النساء، ۹۴)

اے ایمان والو! جب تم اللہ کے راستہ میں نکلو تو خوب تحقیق کر لیا کرو، اور جو شخص تم کو سلام کرے تو اسے (کافر سمجھ کر) یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ قبیلہ بنو سلیم کا ایک آدمی صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے ملا جب کہ یہ حضرات جہاد کے لیے جا رہے تھے، یہ آدمی اپنی بکریاں چرا رہا تھا، اس نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو سلام کیا جو عملا اس بات کا اظہار تھا کہ میں مسلمان ہوں، صحابہ کرام نے سمجھا کہ اس وقت اس نے محض اپنی جان و مال بچانے کے لیے یہ فریب کیا ہے مسلمانوں کی طرح سلام کر کے ہم سے بچ نکلے، چنانچہ انہوں نے اس کو قتل کر دیا اور اس کی بکریوں کو مال غنیمت قرار دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ جو شخص آپ کو اسلامی طرز پر سلام کرے تو بغیر تحقیق کے یہ نہ سمجھو کہ اس نے فریب کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا ہے اور اس کے مال کو مال غنیمت سمجھ کر حلال نہ کرو۔ ترمذی شریف (معارف القرآن ۵۱۹/۲) اس کے علاوہ ایک دوسرے واقعہ کو بہت سے مفسرین نے اس آیت کا شان نزول قرار دیا ہے جو تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔

یہ آیت کریمہ اگرچہ مورد اور شان نزول کے اعتبار سے خاص ہے، مگر اس میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوات والتسلیم کے لیے ایک عام ہدایت بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے کوئی بھی کام بلا تحقیق محض گمان پر کرنا اور کسی عمل پر بغیر تحقیق کے اقدام عمل کرنا جائز نہیں ہے، ایک حدیث میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سوچ سمجھ کر کام کرنا اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔

(ترمذی شریف، باب البر والصلۃ ۲۱/۲، رقم: ۲۰۲۱، معارف القرآن ۵۲۰/۲)

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ. (سورة النساء آیت؛ ۸۳)

جب ان کو کسی امر (جدید) کی خبر پہنچتی ہے خواہ وہ امر موجب امن ہو یا موجب خوف تو اس خبر کو فوراً مشہور کر دیتے ہیں (حالانکہ بعض اوقات وہ غلط نکلتی ہے اور اگر صحیح بھی ہوئی تب بھی بعض اوقات اس کا مشہور کرنا خلاف مصلحت ہوتا ہے) اور اگر (بجائے خوش مشہور کرنے کے) یہ لوگ اس خبر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ان لوگوں کے حوالہ کر دیتے جو ان لوگوں میں سے ایسے امور کو سمجھتے ہیں (اور خود کچھ دخل نہ دیتے) تو اس (خبر کی صحت اور غلط قابل تشہیر ہونے اور نہ ہونے) کو وہ حضرات ضرور پہچان لیتے جو ان میں سے اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں۔''

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے تو اپنے گھر سے مسجد کی طرف آئے، جب مسجد کے دروازہ پر پہنچے تو آپ رضی اللہ عنہ نے سنا کہ مسجد کے اندر لوگوں میں بھی یہی ذکر ہو رہا ہے، یہ دیکھ کر آپ رضی اللہ عنہ نے دل ہی دل میں کہا کہ اس خبر کی تحقیق ہونی چاہیے، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کیا کہ آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ تحقیق کرنے کے بعد میں مسجد کی طرف واپس آیا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے، جو آپ لوگ کہہ رہے ہیں اور سن رہے ہیں وہ سب غلط ہے، اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (مستفاد؛ تفسیر ابن کثیر، سورہ نساء، مکتبہ زکریا دیوبند ۲/ ۳۳۳)

یہ آیت کریمہ بھی اگرچہ اپنے مورد کے اعتبار سے خاص ہے، مگر اس میں امت کے لیے یہ پیغام ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے بیان نہ کریں، اگر ایسا کریں گے تو بڑا فساد اور بڑی خرابی جنم لے گی، اس آیت کے ذیل میں علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

فی هذه الآية انكار على من يبادر الى الامور قبل تحققها فيخبر بها ، ويفشيها وينشرها، وقد لا يكون لها صحة. (ابن كثير ۲/ ۳۳۲، زكريا)

اس آیت کریمہ میں ان لوگوں پر نکیر ہے جو واقعات اور معاملات کو تحقیق سے پہلے لوگوں کو بتاتے اور پھیلاتے پھرتے ہیں، حالانکہ تحقیق کے بعد کبھی کبھی واقعہ غلط اور افواہ ثابت ہوتا ہے۔

اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنْ جَآئَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاءٍ فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِّجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَافَعَلْتُمْ نَادِمِيْن. (سورة الحجرات، آيت: ٦)

''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر پہنچا دو، پھر بعد میں اپنے کیے پر نادم اور پشیمان ہو۔''

اس آیت کریمہ میں بھی ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے، مگر اس کے ذریعہ امت کو دو باتوں کی ہدایت دی گئی ہے، ایک یہ کہ کوئی بھی اجنبی شخص جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو اور اس کی شخصیت کے بارے میں تم جانتے نہ ہو، اس کی باتوں پر بلا تحقیق اعتماد مت کرو۔ دوسرے یہ کہ فوراً اس کی باتیں دوسروں تک مت پہنچاؤ، اگر ایسا کرو گے تو اس سے نقصان اور ضرر کا قوی اندیشہ ہے، پھر بعد میں افسوس سے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كفى بالمرء كذبا ان يحدث بكل ماسمع. (مسلم شريف، باب النهى عن الحديث بكل ماسمع (۱/۸، رقم: ۵)

کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو بلا تحقیق آگے بیان کرے۔

شرّاح حدیث نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں زجر و تنبیہ ہے ان لوگوں کے لیے جو بلا تحقیق ہر سنی ہوئی یا پڑھی ہوئی بات کو آگے دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں۔

هذا زجر عن التحديث بشيى ء لم يعلم صدقه بل على الرجل ان يبحث فى كل ماسمع خصوصا فى احاديث النبى صلى اللّٰه عليه وسلم ، ولذا ورد هذا الحديث فى باب الاعتصام. (مرقاة باب الاعتصام بالكتاب والسنة ۱/ ۲۳۲)

اور ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من حدث عنى حديثا وهو يرى انه كذب فهو احد الكاذبين (ترمذى)

جو شخص کوئی ایسی بات بیان کرے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹی بات ہے تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔

یہ قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ اس بارے میں بے غبار واضح اور دوٹوک ہیں کہ ہر سنی سنائی باتیں اور غیر محقق مضامین اور اخبار دوسروں تک پہنچانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی خود اس پر عمل کرنا جائز ہے؛ بلکہ اولاً ان کی تحقیق کرنا پھر ان پر عمل کرنا اور عمل کی نیت سے ان کو دوسروں تک پہنچانا فرد امت کے لیے لازم اور ضروری ہے، آئے دن بہت سی دینی باتیں اور میسیجز سوشل میڈیا پر قرآن و حدیث کے حوالہ کے ساتھ گردش کرتی رہتی ہیں اور ان کے آخر میں آگے پہنچانے کی ترغیب اور اس پر ملنے والا اجر و ثواب درج ہوتا ہے، مگر تحقیق کے بعد بسا اوقات حوالہ اور کبھی کبھی پوری

بات غلط ثابت ہوتی ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے والوں کے لیے جہنم کی وعید سنائی ہے، ارشاد فرمایا:

من كذب على متعمدا فليتبوا مقعده من النار. (بخاری شريف، الجنائز، باب مايكره من النياحة على الميت ۱/۱۷۲، ۱۲۷۷)

جس شخص نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا تو اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد ہمارے اکابر اور خصوصا صحابہ کرامؓ کے سامنے ہمہ وقت رہتا تھا، احادیث رسول کے بیان کرنے میں اور اسے قبول کرنے میں یہ حضرات غیر معمولی احتیاط برتتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا: السلام علیکم، عبداللہ بن قیس حاضر ہوا ہے، انہوں نے آنے کی اجازت نہ دی، انہوں نے پھر کہا: السلام علیکم یہ ابوموسیٰ ہے، السلام علیکم یہ اشعری ہے، اس کے بعد چلے گئے، حضرت عمرؓ نے کہا: ان کو میرے پاس لاؤ وہ آئے تو حضرتؓ نے کہا: ابوموسیٰ! آپ کو کس بات نے لوٹایا؟ ہم کام میں مشغول تھے، انہوں نے کہا؛ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اجازت تین بار طلب کی جائے، اگر تم کو اجازت دے دی جائے تو آجاؤ ورنہ لوٹ جاؤ، حضرت عمرؓ نے کہا: یا تو آپ اس پر گواہ لائیں گے یا پھر میں یہ یہ کروں گا (کوڑا ماروں گا، سزا دوں گا) تو حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ چلے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا؛ اگر ابوموسیٰ کو گواہ مل گئے تو شام کو وہ تم کو منبر کے پاس ملیں گے اور اگر ان کو گواہ نہیں ملا تو وہ تمہیں نہیں ملیں گے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کو آئے تو انہوں نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو موجود پایا، انہوں نے کہا: ابوموسیٰ کیا کہتے ہو؟ آپ کو گواہ مل گیا؟ انہوں نے کہا: ہاں! ابی بن کعب ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ قابل اعتماد گواہ ہیں، پھر حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: ابوطفیل! یہ کیا کہتے ہیں؟ تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابن الخطاب! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے وہ یہی فرمارہے تھے، لہٰذا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر عذاب نہ بنیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: سبحان اللہ! میں نے ایک چیز سنی اور چاہا کہ اس کا ثبوت حاصل کروں اور اس کے بارے میں قطعیت کو جانوں۔ (مسلم شریف، کتاب الادب، باب الاستئذان ۲/۲۱۰، رقم: ۲۱۵۴) اس واقعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حضرات احادیث قبول کرنے میں اور بیان کرنے میں کس قدر محتاط رہتے تھے۔ اس لیے ہم سب کو بھی سوشل میڈیا کے استعمال میں بے حد احتیاط برتنے کی ضرورت ہے، خصوصا اس وقت جب اس کا تعلق کتاب و سنت اور دین و شریعت اور سماج و معاشرہ سے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

کتب ادب وانشا کا طریقہ تدریس

مولانا محمد اجمل قاسمی (مرادآباد)

ماہنامہ وفاق المدارس میں ایک تسلسل سے تدریسی مہارتوں کے متعلق وقیع مضامین شائع کیے جارہے ہیں، جنہیں توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ ذیل کا مضمون اگرچہ ادب وانشا کی چند خاص کتابوں کے طریقہ تدریس کا احاطہ کرتا ہے؛ مگر اپنے مندرجات کے اعتبار سے اس کا فائدہ عام ہے، اسی لیے اس مضمون کو شمارے میں جگہ دی جارہی ہے۔ قارئین اور اساتذہ ادب وانشا اسی نظر سے اس کا مطالعہ فرمائیں۔ (مدیر)

ہمارے تعلیمی نصاب میں شامل کتابیں خاص مقاصد کے تحت رکھی گئی ہیں، کتابوں کی تدریس کے مقاصد کیا ہیں؟ ان سے واقفیت ازبس ضروری ہے، اس لیے کہ مقاصد کی واقفیت سے ہی طرز تدریس کی تعیین ہوتی ہے، اور مناسب طریقۂ تدریس سے ہی مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں، کتابوں کے مقاصد اور ان کے مطلوب طریقۂ تدریس سے واقفیت بھی اہم اور ضروری ہے، ہمارے مدارس کے نظام میں بالعموم یہ پہلو اتنا ہی بے توجہی کا شکار رہا ہے، چنانچہ ہمارے یہاں کتابوں کی تدریس کے سلسلے میں بڑا انتشار پیدا ہوجاتا ہے، ہر شخص اپنے اپنے ذوق و تجربے کے اعتبار سے تدریس کرتا ہے، جس کی وجہ سے بہت سی دفعہ کتاب کی تدریس کا مقصد کما حقہ حاصل نہیں ہو پاتا، اور ممتحن حضرات بھی اپنے اپنے انداز میں امتحان لیتے ہیں، کسی متعین نہج کے پابند نہیں ہوتے، نتیجتاً امتحان کے نتائج سے طلبہ کی صحیح تعلیمی صورت حال سامنے نہیں آپاتی، لہٰذا ضروری ہوا کہ حضرات اساتذۂ کرام کے سامنے کتابوں کا صحیح طریقۂ تدریس واضح اور متعین کیا جائے، تاکہ کتابوں کی تدریس کے مقاصد بھی حاصل ہوں، اور امتحان میں ممتحن حضرات کو بھی اسی نہج کے مطابق امتحان لینے کا پابند کیا جائے، تاکہ نتائج امتحان سے طلبہ کی صحیح تعلیمی حالت سامنے آئے۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ زیر بحث کتابوں کی تدریس کا مقصد کیا ہے؟ سو اس سلسلے میں عرض ہے کہ ان کتابوں کا مشترکہ مقصد ''طلبہ میں بتدریج عربی بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے'' مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ کسی بھی زبان پر قدرت نام ہے اس کی

چار مہارتوں پر قدرت حاصل کرنے کا، جس کو زبان کی چاروں مہارتیں حاصل ہیں اس کی زبان دانی کامل ہے، اور اس کے برعکس جو زبان کی جتنی مہارتوں میں خام ہوگا اس کی زبان دانی اسی کے بقدر ناقص ہوگی، زبان کی مہاراتِ اربع درج ذیل ہیں:

(۱)**القراءۃ**..... یعنی زبان کو پڑھنے کی مہارت، اس کا مطلب یہ ہے کہ زبان کو صحیح تلفظ اور اچھے لب ولہجہ کے ساتھ از رُوئے قواعد صحیح پڑھا جائے۔

(۲)**الفھم**..... زبان کو سمجھنے کی مہارت، سمجھنے میں پڑھ کر سمجھنا بھی مراد ہے اور سن کر سمجھنا بھی۔

(۳)**الکلام**..... یعنی زبان کو بولنے کی مہارت۔

(۴)**الکتابۃ**..... زبان میں لکھنے اور مضمون نگاری کی مہارت۔

جہاں تک قـــراءت کا تعلق ہے، تو طلبہ کو تلفظ کی صحت تجوید کے ذریعہ اور صحیح عبارت خوانی نحو وصرف کی کتابوں کے پڑھنے سے بتدریج حاصل ہوجاتی ہے؛ البتہ صحیح لب ولہجہ کی کمی عموماً باقی رہتی ہے، اور رہا فھـــم تو یہ بھی مدارس کے طلبہ کو قواعد اور دیگر علوم وفنون کی عربی کتابوں کے ذریعہ بتدریج حاصل ہوجاتا ہے؛ البتہ ان کے اس فہم کا دائرہ عموماً قدیم زبان اور مدارس میں پڑھے پڑھائے جانے والے علوم تک محدود ہوتا ہے، بالعموم طلبہ دورِ حاضر کی زبان اور مدارس میں متداول علوم کے علاوہ موضوعات کو سمجھنے پر قادر نہیں ہوتے؛ اس لیے کہ ان کو اپنی نصابی کتابوں میں نہ جدید زبان سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے، اور نہ ہی زندگی کے عام موضوعات سے۔

اب بچی دو مہارتیں: ایک بولنے کی اور ایک لکھنے اور معیاری ترجمہ کرنے کی، تو یہ دونوں مہارتیں انشاء اور ادب کی کتابوں سے پیدا کی جائیں گی، نیز طلبہ میں قراءت اور فہم کی جو کمزوریاں باقی رہ گئی ہیں جن کی طرف ابھی اوپر اشارہ کیا گیا ان کا ازالہ بھی یہاں کرنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انشاء وادب کی کتابوں کا اصل مقصد بتدریج عربی زبان میں بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، اور قراءت وفہم میں جو کمزوریاں رہ گئی ہیں ان کا ازالہ کرنا ہے۔ ان کتابوں کی تدریس کا یہ مقصد اگر پیش نظر ہو تو یہ بات سمجھنے میں ہمیں دیر نہیں لگے گی کہ یہ کتابیں ہمیں اس طرح پڑھانی ہیں کہ کتاب میں آنے والے جو دروس ہیں طلبہ کو نہ صرف ان کا ترجمہ یاد کرانا ہے؛ بلکہ ان دروس کو اس طرح ازبر کرانا ہے کہ طلبہ ان دروس میں آئے الفاظ ومفردات اور تعبیرات کے استعمال پر پوری طرح قادر ہوجائیں، اور جب وہ عربی زبان میں لکھنا یہ بولنا چاہیں تو یہ الفاظ وتعبیرات بلاتکلف برموقع ان کے زبان وقلم پر جاری ہوجائیں۔

اس وضاحت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انشاء وادب کی کتابوں کی تدریس اور دیگر علوم وفنون کی کتابوں کی

تدریس میں بنیادی فرق ہے، دیگر کتابوں میں ہمیں عبارت میں ذکر کردہ مضامین کو سمجھنا اور ترجمہ یاد کر لینا کافی ہوتا ہے، جبکہ انشاء اور ادب کی کتابوں میں معانی سے زیادہ عربی الفاظ وتعبیرات کو یاد کر کے ان کو برتنا اور ان کے استعمال کی قدرت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

طرز تدریس کے بارے میں عمومی ہدایات:

حضرات! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انشاء وادب کی کتابوں کا طریقہ تدریس کیا ہوگا جن کی پیروی کر کے ہم طلبہ کو اس معیار تک پہونچا سکتے ہیں کہ وہ جہاں مفردات وتراکیب اور تعبیرات کے اردو متبادل سے واقف ہوں وہیں براہ راست عربی میں بھی ان کے استعمال پر پوری طرح قادر ہوں، سو اس سلسلے میں کچھ عمومی معروضات پیش کی جاتی ہیں، جو ہمارے نصاب میں شامل تمام کتابوں کی تدریس میں ملحوظ رکھنی ہوں گی، اور کچھ خصوصی ہدایات ہیں جو ہر ہر کتاب کے طریقہ تدریس کے ضمن میں علاحدہ بیان ہوں گی:

(۱).....سبق میں آنے والے مفرادت کو لکھا کر ان کو اچھی طرح یاد کرانے کا اہتمام کیا جائے، اور جس طرح عربی الفاظ کے اردو متبادل سنے جائیں اسی طرح اردو معانی کو پوچھ کر ان کے عربی الفاظ کو بھی سننے کا اہتمام کیا جائے، اس طرح انہیں جہاں عربی الفاظ کے اردو متبادل معلوم ہوں گے، وہیں اردو مفاہیم کے لیے عربی الفاظ بھی یاد ہوں گے، اور بولنے اور لکھنے میں معاون ہوں گے، کیوں کہ بولنے اور لکھنے کے لیے اردو کے متبادل عربی الفاظ کا بروقت یاد آنا نہایت ضروری ہے، اس کے بغیر آپ نہ زبان لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں، عربی زبان کے باتوفیق استاذ حضرت مولانا وحیدالزمان کیرانوی لکھتے ہیں:

''نیز عربی الفاظ کے معنیٰ جیسے اردو میں یاد کرائے جائیں اسی طرح اردو الفاظ کے عربی معنی بھی یاد کرائے جائیں، اس طرح زبان کے دونوں رخ سامنے رہیں گے اور تکلم وانشاء میں سہولت رہے گی'' (شرح القراءۃ الواضحۃ جزءاول ص۴)

مثال کے طور ہم طلبہ سے جہاں ''مَطارٌ، طائرةٌ، راکبٌ، جَوٌ'' کے اردو معانی پوچھیں وہیں اس کے برعکس اردو کے الفاظ ''ہوائی اڈہ، ہوائی جہاز، مسافر، فضا'' کے عربی متبادل بھی پوچھیں۔

لغات سننے میں طلبہ کو محض حافظے سے ترتیب وار لغات سنانے کا پابند نہ کیا جائے، اس سے طلبہ پر حفظِ لغات کے ساتھ حفظِ ترتیب کا دہرا بار پڑتا ہے، استاذ کو چاہیے کہ مختلف طلبہ سے متفرق الفاظ کے معانی پوچھ لے، اس طرح سننے سے طلبہ کو سہولت ہوگی۔

(۲).....کثرتِ قراءت وکتابت پر زور:.....تمام طلبہ سے صحیح تلفظ اور خالص عربی لب ولہجے میں سبق کی جہراً قراءت روزانہ کرائی جائے،طلبہ اگر زیادہ ہیں تو باری بنائی جائے، یا تھوڑی تھوڑی عبارت کئی طلبہ سے پڑھوائی جائے،مگر کسی کو عبارت خوانی سے مستثنیٰ نہ رکھا جائے، جو عبارت طلبہ کو استاذ کے سامنے پڑھنی ہے،طلبہ پہلے اسے کم از کم دس بارہ بار خارج میں صحیح تلفظ اور درست لہجے میں پڑھ کر آئیں،طلبہ کو یہ بھی تاکید کی جائے کہ سمجھ کر اور ذہن کو حاضر رکھ کر پڑھیں،تاکہ زیادہ سے زیادہ الفاظ وتعبیرات ذہن نشین ہوسکیں۔

ہر زبان کا اپنا لہجہ اور طرز ادا ہوتا ہے،اور اس کو اسی لہجے میں بولا جاتا ہے،جب طالب علم صحیح تلفظ اور عربی لب و لہجے میں قراءت کی پابندی کرے گا،تو رفتہ رفتہ وہ عربی لہجہ سیکھ جائے گا۔کثرت قراءت کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ زبان ٹوٹے گی جس سے عربی نطق میں سہولت پیدا ہوگی، بسا اوقات آدمی جب بولنے کا ارادہ کرتا ہے تو ذہن میں صحیح لفظ آتا ہے،مگر بولتے ہوئے کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے،ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ زبان عربی الفاظ کی ادائیگی کی عادی نہیں ہوتی؛لہٰذا کثرت قراءت کے ذریعہ زبان کو عربی نطق کا عادی بنانا ضروری ہے۔

تیسرا فائدہ جو سب سے اہم ہے وہ یہ کہ کثرتِ قراءت سے طالب علم کو مفردات کے ساتھ تعبیرات کا بھی بڑا حصہ یاد ہوجاتا ہے،اور لکھنے بولنے میں سب سے بنیادی کردار ذخیرہ الفاظ وتعبیرات کا ہی ہے۔

کثرتِ قراءت کی طرح کثرتِ کتابت سے بھی چیزیں حافظے میں ازبر ہوتی ہیں،نیز کثرت سے لکھتے رہنے سے ہی آدمی خوب نویس اور بسیار نویس بنتا ہے،اس لیے صحت املا کی رعایت کے ساتھ طالب علم کو اسباق سے متعلق تمرینات کے لکھنے کا پابند کرنا بھی ضروری ہے۔حضرت مولانا نور عالم صاحب امینی رحمۃ اللہ علیہ زبان سیکھنے میں قراءت وکتابت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عبارت کی خواندگی اور عبارت نویسی دونوں پر بہت زیادہ توجہ دی جائے،طلبہ کو مکلّف کیا جائے کہ وہ عبارت کو صحت تلفظ کے ساتھ بار بار پڑھیں اور صحت املا کے ساتھ اپنی کاپیوں میں اسے کثرت سے لکھیں،ابتدائی مرحلے میں زبان آموزی کے حوالے سے پڑھنے اور لکھنے کی بڑی اہمیت ہے، یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے، کہ الفاظ وعبارت کی مطلوبہ مقدار میں خواندگی اور املانویسی کے بغیر ان کا ترجمہ بتادینے سے زبان سکھانے کا عمل کبھی بارآور نہیں ہوتا۔''(مفتاح العربیہ ص۵)

(۳).....تمرینات کا خصوصی اہتمام:طلبہ کو تمرینات کثرت سے کرائی جائیں،تاکہ سبق کے زیادہ سے الفاظ انہیں یاد بھی ہوجائیں اور ان کے استعمال پر قدرت بھی ہوجائے،تمرینات تحریری بھی کرائی جائیں،اور زبانی بھی، زبانی تمرین تحریری تمرین کی تصحیح کے بعد ہوگی،جس تحریری تمرین کی تصحیح آپ کل کرچکے ہیں،آج اس کی شفوی مشق

کرائیں، زبانی تمرین کے لیے دو طریقے اپنائے جائیں: ایک یہ کہ استاذ طلبہ سے سوالات کرے، دوسرے یہ کہ طلبہ کی جوڑی بنائی جائے، محادثات والی تمرینات میں دو دو طالب علم کو کھڑا کر کے ان کے درمیان محادثے کرائے جائیں، سوال وجواب والی تمرینات میں بھی یہی طریقہ اپنایا جائے، اور جن کتابوں میں عربی سے اردو اور برعکس تمرینات موجود ہیں، ان میں دو دو طالب علموں کو کھڑا کر کے اس طرح تمرین کرائیں، کہ اردو سے عربی والی تمرینات میں ایک طالب علم اردو بولے، اور دوسرا کاپی دیکھے بغیر اس کی عربی بتائے، اسی طرح اگر تمرین برعکس ہے تو ایک عربی بولے اور دوسرا فوراً اس کا ترجمہ کرے، تمام تمرینات اس طرح کرائی جائیں، کہ سبق کے زیادہ سے زیادہ الفاظ طالب علم کی زبان وقلم پر جاری ہو جائیں، اور جب طلبہ آپس میں شفوی تمرین میں مصروف ہوں اسی دوران آپ آج کا ہوم ورک بھی چیک کرتے رہیں، اس سے آپ کا وقت بچے گا۔

(۴)...... گھنٹے میں جتنے کام آپ کو کرنے ہیں، آپ اس کی ایک ترتیب بنائیں، اور ہر کام کے لیے گھنٹے کے کچھ منٹ مختص کریں، مثلاً آپ کو اگر یہ چند کام کرنے ہیں: سبق کا ترجمہ اور لغات سننا ہے، طلبہ کو زبانی تمرین کرانی ہے، تحریری تمرینات کو چیک کرنا ہے، اگلے سبق کی قراءت کرانی ہے، اس کی لغات لکھوا کر ترجمہ کرانا اور آگے ہوم ورک دینا ہے، تو ان تمام کاموں کے لیے گھنٹے کا کچھ کچھ حصہ مختص کریں، تاکہ سارے کام ہوتے رہیں، اور سبق کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔

ان عمومی معروضات کے بعد اب ہم درجہ وار الگ الگ کتابوں کے بارے کچھ خصوصی معروضات پیش کرتے ہیں۔

مفتاح العربیہ:

(۱)...... مولف کتاب نے اسکولی نصابی کتابوں کے طرز پر کتاب کے شروع میں تعلیمی ہدایات کے عنوان سے ۲۱ ہدایات برائے معلمین تحریر کی ہیں، ان ہدایات کو بار بار بغور پڑھا جائے، اور بوقت تدریس برتا جائے۔

(۲)...... بیشتر اسباق کے آغاز میں حاشیہ میں خاص اس سبق سے متعلق کچھ جزوی ہدایات بھی دی ہیں، جس سبق کے ذیل میں جو ہدایات دی ہیں اس سبق میں ان ہدایات کی پابندی کی جائے، کتاب کے شروع میں ذکر کردہ تعلیمی ہدایات کے بعد اسباق کے ذیل میں ذکر کردہ امور نے قدم بقدم طریق تدریس کو اس طرح واضح کر دیا ہے، کہ مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، ضرورت بس اس کی ہے کہ کیف ما اتفق اپنے ذوق سے تدریس کے بجائے ان کی پیروی کی جائے۔

(۳)...... کتاب کے حاشیہ میں قواعد کی وضاحت جس قدر کی گئی ہے، بس اتنی ہی وضاحت کی جائے، اس سے زیادہ تفصیلات بتا کر نو وارد طلبہ پر قواعد کا غیر ضروری بار نہ ڈالا جائے۔

(۴).....کتاب کے اخیر میں سبق وار سبق میں مستعمل عربی واردو الفاظ کا ترجمہ دیا گیا ہے، الگ سے لغات لکھانے کے بجائے بس وہی ترجمہ یاد کرایا جائے، اپنی طرف سے جمع وغیرہ کی مزید تفصیلات نہ بتائی جائیں، بالکل مبتدی طلبہ اس کے متحمل نہ ہوں گے۔

(۵).....پہلے حصہ میں صرف اسماء کا استعمال کرایا گیا ہے، جس کی صراحت مؤلف نے کتاب کے شروع میں کردی ہے، لہٰذا اردو سے عربی کی تمرینات میں بہت سے مقامات ایسے آئے ہیں، جہاں خبر اسم فاعل بھی آسکتی ہے، اور فعل کی شکل میں بھی لائی جاسکتی ہے، مثال کے طور پر'' سعیدہ نئی کاپی میں لکھ رہی ہے''اس میں آپ''**سعیدة کاتبة فی دفتر جدید**'' بھی کہہ سکتے ہیں، اور''**سعیدة تکتب فی دفتر جدید**'' بھی بول سکتے ہیں، مگر آپ یہاں بجائے فعل کے اسم ہی استعمال کرائیں۔

(۵).....عمومی معروضات میں جو چار باتیں عرض کی گئی ہیں ان کا خاص خیال رکھا جائے۔

القراءۃ الواضحۃ کے تینوں اجزاء کا طریقہ تدریس:

(۱).....القراءۃ الواضحۃ کے پہلے حصہ کے شروع میں اور اسی طرح مؤلف کے قلم سے لکھی ہوئی پہلے جزء کی شرح میں ضروری ملاحظات دئے گئے ہیں، نیز کتاب کی ترتیب اور طریقہ تدریس پر روشنی ڈالی گئی ہے، القراءۃ الواضحہ کے کسی بھی حصہ کی تدریس سے پہلے ان چیزوں کو پڑھنا بے حد ضروری ہے۔

(۲).....مؤلف کتاب نے القراءۃ الواضحہ کے تینوں حصوں کی خود شرح بھی تالیف فرمائی ہے، جس سے القراءۃ الواضحۃ کی تدریس میں بڑی مدد بھی ملے گی، اور یہ بھی بڑی حد تک واضح ہوجائے گا کہ کس سبق کو کیسے پڑھانا ہے، لہٰذا القراءۃ الواضحہ کی تدریس میں اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

(۳).....عمومی چار ہدایتوں میں حفظ لغات، کثرت کتابت وقراءت، تمرینات کے خصوصی اہتمام، اس کے طریقے، اور گھنٹے کے کاموں کے اعتبار سے گھنٹے کی ترتیب قائم کرنے کی جو بات کہی گئی ہے، ان کو برتنے کی پوری کوشش کی جائے۔

(۴).....القراءۃ الواضحۃ میں لغات لکھاتے ہوئے چند امور کا خیال رکھیں:

(الف).....صرف نئے الفاظ کی لغات لکھوائی جائیں، طلبہ کو بتادیا جائے کہ جو الفاظ آچکے ہیں انہیں دیکھ کر آئیں سبق میں ان کے معانی پوچھے جائیں گے، اور پوچھنے پر نہ بتائیں تو مناسب تنبیہ کی جائے، اس طرح پرانی لغات یاد بھی رہیں گی، اور آگے لغات لکھانے اور یاد کرنے کا کام بھی مختصر رہے گا۔

(ب).....الفاظ کا صرف وہ معنی لکھایا اور بتایا جائے جو اس جگہ مراد ہے، دیگر معانی سے تعرض ہرگز نہ کیا

جائے، یہ مبتدی طلبہ کے لیے پریشان کن ہوگا، اور طلب الکل فوت الکل کا سبب بنے گا۔

(ج).....جزء اول میں جن الفاظ کی جموع کثیر الاستعمال یا معروف ہیں انہی کے لکھانے پر اکتفاء کیا جائے، البتہ بعد کے حصوں میں بتدریج مفردات کی جموع اور جموع کے مفردات لکھوانے میں توسیع کی جائے۔

(د).....افعال میں ماضی مضارع مصدر اور فعل کا صلہ ہے تو صلہ کو بھی لکھوانے اور یاد کرانے کا اس طرح التزام کیا جائے کہ فعل طالب علم کے ذہن میں جب آئے تو اپنے صلہ کے ساتھ آئے، نیز باب بھی لکھوائے جائیں۔

ماضی مضارع دونوں کو لکھانے سے باب کے یاد رکھنے میں سہولت ہوتی ہے، اور باب کا یاد رکھنا ضروری ہے، اس لیے کہ باب بدلنے سے اکثر اوقات معانی بدل جاتے ہیں، مثال کے طور پر حزن حزناً اگر نصر سے آئے تو اس کے معنی آتے ہیں ''غمگین کرنا'' اسی سے ''محزون'' آتا ہے، اور اگر سمع سے آئے تو معنی ہوتا ہے ''غمگین ہونا'' اس سے ''حزین'' آتا ہے، اس طرح ذعر ذعراً اگر فتح سے آئے تو معنی ہوتا ہے ''خوف زدہ کرنا'' اور اگر سمع سے آئے تو معنی آتا ہے ''خوف زدہ ہونا'' لہٰذا جو معنیٰ مراد ہے اسی کا لحاظ کر کے باب لکھایا جائے۔

اسی طرح مصدر بھی لکھانا ضروری ہے، اس لیے کہ بسا اوقات مصدر کے بدلنے سے بھی معنی بدلتا ہے، جیسے وَقَف کا مصدر اگر وقفاً آئے تو اس کے معنی آتے ہیں ''روکنا'' جیسے ''وقف السائقُ السیارۃَ'' اور ''وقوفًا'' مصدر آئے تو اس کے معنی آتے ہیں ''رکنا'' جیسے ''وقف القطارُ'' لہٰذا معنی مرادی کا لحاظ کر کے مصدر بھی لکھوائے جائیں، اسی طرح صلات کا لکھانا اور یاد کرانا بھی نہایت اہم ہے؛ اس لیے کہ صلات والے افعال صلات کے بغیر نامکمل ہوتے ہیں، نیز صلات کے بدلنے سے اکثر اوقات معانی بھی بدل جاتے ہیں، مثال کے طور پر ''دعا لہ'' کے معنی آتے ہیں ''دعا کرنا'' اور ''علیہ'' صلہ آئے تو اس کے معنی آتے ہیں بددعا کرنا، اسی طرح ''رغب'' کا صلہ ''فی'' آئے تو معنی ہوتا ہے ''کسی چیز میں رغبت کرنا'' اور ''عن'' صلہ ہو تو ''بے رغبتی'' کا معنی پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے صلہ کا لکھونا اور یاد کرانا بھی بہت ضروری ہے۔ مولانا وحید الزماں رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''افعال کے ساتھ جہاں جو صلات استعمال ہوں ان کو افعال کا ایسا جزو لازم تصور کرایا جائے، کہ جب طالب علم اس فعل کو زبان یا نوک قلم پر لائے تو معاً اس کا صلہ بھی ذہن میں آجائے۔'' (دلیل القراءۃ الواضحۃ ۱/۴)

(۵).....القراءۃ الواضحۃ کے تینوں حصوں کے اسباق نحو کے خاص خاص قواعد کو سامنے رکھ کر ترتیب دئے گئے ہیں، کس سبق میں کون سا قاعدہ پیش نظر ہے، اس کی فہرست حصہ اول و دوم کے آخر میں دے دی گئی ہے، اور حصہ سوم میں تمرینات سے معلوم ہو جائے گی، استاذ طلبہ کے سامنے مختصراً سادہ انداز میں ان کو قواعد کی وضاحت کر دے، قواعد

کی جو تفصیلات سبق میں استعمال نہیں کی گئیں ان کے بیان سے گریز کرے، اور زیادہ زور مشق وتمرین اور الفاظ کے صحیح استعمال پر صرف کرے۔

(۶)......القراءۃ الواضحۃ کے پہلے حصہ کے سبق نمبر ۳۰، ۳۱، اور ۳۲ میں اعداد اور عدد رتبی کی مشق کرائی گئی ہے، اسی طرح دوسرے حصے کے ۲۹ تا ۳۲ چار اسباق میں اعداد اور گھنٹہ ومنٹ بتانے کا طریقہ بتایا گیا ہے، یہ اسباق خصوصی اہمیت کے حامل ہیں، طلبہ اعداد میں کمزور ہوتے ہیں، اور یہ کمزوری آخر تک باقی رہتی ہے، اس لیے اعداد کی زبانی مشق طلبہ سے خوب کرائی جائے، معدود کو مذکر ومونث میں بدل بدل کر طلبہ سے بار بار گنتی کرائی جائے، پہلے استاذ دو تین بار ایک دہائی گن کر طلبہ کو سنائے، پھر طلبہ سے دہرانے کو کہے، اس طرح ایک ایک دہائی بڑھا تا جائے، یاد رہے اعداد کے قواعد قدرے پیچیدہ ہیں، قواعد کو جان کر گنتی گننا آسان نہیں ہے، کثرتِ مشق سے ہی صحیح گنتی گننے کا عادی بنایا جا سکتا ہے، اس لیے مشق پر زیادہ سے زیادہ زور ہو، پھر مختصراً قواعد کی تشریح میں بھی مضائقہ نہیں۔

(۷)......القراءۃ الواضحۃ میں بعض تمرینات میں طلبہ کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ کتاب سے سوالات نکال کر اس کا جواب تحریر کریں، استاذ کو چاہیے کہ طلبہ کو سوالات بنانے کا طریقہ بتائے تاکہ طلبہ بآسانی سوالات نکال کر ان کے جوابات لکھ سکیں، ہم عبارت کو سوال میں تبدیل کرنے کا ایک نمونہ بطور مثال پیش کرتے ہیں، اس سے آپ بآسانی سوالات بنانے کا طریقہ سمجھ سکتے ہیں:

لَمّا وَصَلَ الطالبُ إلى الْفَصْلِ فَتحَ الكِتابَ أمامَ الأستاذِ لِيَقْرأ

دیکھئے اس چھوٹے سے جملے سے کتنے سوالات اخذ کئے جاتے ہیں اور کیسے اخذ کئے جاتے ہیں:

۱- مَن وصلَ إلى الفصل؟ ۲- أين وصل الطالبُ؟ ۳-ماذا فعل الطالبُ؟ ۴-من فتح الكتابَ؟ ۵-ماذا فتح الطالبُ؟ ۶-متى فتح الطالبُ الكتابَ؟ ۷-أمام من فتح الكتابَ؟ ۸- أفَتَح الكتابَ أما م زميله؟ ۹-هل وصل الطالب إلى الفصل؟ ۱۰-لماذا فتح الكتاب؟ ۱۱-أمَا فَتَح الكتابَ أمام الأستاذ؟

اس چھوٹے سے جملے سے گیارہ سوالات بن گئے اور بھی بہت سے بن سکتے ہیں، ہم نے جملے سے فاعل کو حذف کرکے مَن داخل کر دیا سوال بن گیا، ظرف مکان حذف کرکے ''این'' داخل کیا، سوال بن گیا، مفعول بہ حذف کرکے ''ماذا'' داخل کیا سوال بن گیا، وقت کو حذف کرکے ''متیٰ'' داخل کیا سوال بن گیا، جملے کو اپنی حالت پر رکھتے ہوئے ''هل''، داخل کر دیا سوال بن گیا، علت کو حذف کرکے ''لماذا'' داخل کر دیا سوال بن

گیا، ''أما'' کو داخل کر دیا سوال بن گیا۔اس طرح دو تین دن اگر طلبہ کو سوال نکالنے کا طریقہ بتا دیا جائے تو طلبہ بآسانی یہ کام کرنے لگیں گے۔

(۸).....القراءۃ الواضحۃ کے تیسرے حصہ میں قواعد کی روشنی میں طلبہ کو جملے سازی کا مکلّف بنایا گیا ہے،طلبہ جملے اگر خود بناتے ہیں تو وہ اپنے جملوں میں سبق کی تعبیرات عموماً استعمال نہیں کر پاتے ،دوسرے ہر طالب کے جملے دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں جس سے کاپی چیک کرنے میں بڑا وقت صرف ہوتا ہے اور دقت بھی پیش آتی ہے،اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود استاذ سبق کے الفاظ وتعبیرات کا لحاظ کرتے ہوئے اردو میں جملے لکھوادے اورانہیں کو عربی میں تبدیل کرنے کا مکلّف بنائے ،اس سے سبق کی تعبیرات بھی استعمال میں آجائیں گی ،اور کاپی چیک کرنے میں بھی سہولت ہوگی ،نیز اردو سے عربی تمرین کی مشق بھی ہوجائے گی ،جس سے ہر سہ حصے خالی ہیں،اوران جملوں کا رٹ لینا امتحان میں بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

(۹).....فن انشا کی طرح ترجمہ بھی ایک مستقل فن ہے،ان کتابوں کے ذریعہ جہاں ہمیں طلبہ کو انشا سکھانی ہے، وہیں ان میں بتدریج معیاری ترجمہ کا سلیقہ بھی پیدا کرنا ہے،مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

''عام طور پر ہمارے مدارس میں جو ترجمہ کیا جاتا ہے،اس میں اس زبان کے قواعد ملحوظ رکھے جاتے ہیں جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے،حالاں کہ ترجمہ کا مسلم اصول اس کے برعکس ہے،یعنی جس زبان میں ترجمہ کیا جائے اس کے قواعد ملحوظ رکھے جاتے ہیں،اس صورت میں ترجمہ سلیس وشگفتہ ہوجاتا ہے۔''(شرح نفحۃ الادب،ص۳)

اسی سے ملتی جلتی بات حضرت نے شرح القراءۃ الواضحۃ جزءاول میں ضروری ملاحظات کے عنوان کے تحت لکھی ہے،القراءۃ الواضحۃ کے تینوں حصوں کی عبارت آسان ہے؛لہٰذا سلیس اردو ترجمہ بھی عبارت کے بالکل قریب رہ کر ممکن ہے،اس لیے اس کا لحاظ کیا جانا چاہیئے ،اوراس سلسلے میں مولانا کیرانوی کے ترجمہ سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔

ترجمہ میں اردو کے قواعد کی رعایت کس طرح کی جاتی ہے،اس کے لیے ہم دو نمونے میں پیش کرتے ہیں،عربی میں عموماً فعل شروع میں آتا ہے اور فاعل بعد میں،جبکہ اردو میں فاعل پہلے اور فعل بالکل اخیر میں آتا ہے،جیسے عربی میں آپ کہیں گے رکبَ حامدٌ الدراجۃ اور اردو میں آپ کہیں گے:''حامد سائیکل پر سوار ہوا''عربی جملے میں فعل شروع میں ہے،جبکہ اردو جملے میں بالکل اخیر میں ہے،اگر تحت اللفظ ترجمہ کر دیا جائے تو اردو کے اسلوب کے خلاف ہوجائے گا۔اسی طرح ہم جب افعال کا ترجمہ کرتے ہیں تو عربی فعل کا اردو متبادل لاتے ہیں،مگر عربی افعال کے جو صلات ہیں ہم ترجمہ کرتے ہوئے اردو میں ان کے متبادل نہیں لاتے ، بلکہ اردو فعل کا لحاظ کرتے ہیں اگر وہ صلہ نہیں چاہتا تو نہیں لاتے ،مثلاً عربی میں ہم کہتے ہیں ذھبَ حامدٌ إلی السوقِ اور اردو میں کہتے ہیں''حامد

بازار گیا''، اردو فعل ''گیا'' صلہ نہیں چاہتا، اس لیے ہم اس کا لحاظ کرتے ہوئے صلہ نہیں لائے، اور اگر اردو کا فعل صلہ چاہتا ہے تو جو صلہ وہ چاہتا ہے وہی لاتے ہیں عربی والے کا اردو متبادل نہیں لاتے، مثلاً ہم عربی میں کہتے ہیں: شکوتُ إلی الإستاذِ مگر اردو میں ہم ''إلیٰ'' کا متبادل ''تک'' لانے کے بجائے ''سے'' استعمال کرتے ہیں چنانچہ ہم کہتے ہیں: ''میں نے استاذ سے شکایت کی''، اسی طرح عربی میں کہتے ہیں: تمکن حامدٌ مِن التدریس مگر اردو میں ''مِن'' کا متبادل ''سے'' لانے کے بجائے ''پر'' لاتے ہیں اور کہتے ہیں ''حامد تدریس پر قادر ہو گیا'' اس لیے کہ اردو فعل قادر ہونا ''پر'' صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، بہر حال ترجمہ میں زبانِ مترجَم الیہ کی رعایت ضروری ہے، اگر ایسا نہیں کریں گے تو ترجمہ اردو کے استعمال کے لحاظ سے غلط ہو جائے گا، یہ دو نمونے ہیں، اور بھی نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں مگر خوف طوالت دامن گیر ہے۔

نفحة الأدب ونفحة العرب کا طریقہ تدریس:

حضرات! عربی ادب کی کتابوں کی تدریس کا مقصد ان سے الفاظ وتعبیرات اخذ کر کے اپنے ذخیرہ الفاظ وتعبیرات میں اضافہ کرنا اور ان سے اسلوب اخذ کرنا ہوتا ہے، پہلی کتاب ان دونوں مقاصد میں بڑی حد تک معاون ہے، البتہ دوسری کتاب پہلے مقصد میں تو معاون ہے، لیکن دوسرے مقصد میں زیادہ معاون نہیں ہے، ہاں اس کی نثر قدیم اسلوب پر ہے، اس لیے یہ نثر احادیث وسیر اور ادب وغیرہ کی قدیم کتابوں کے سمجھنے میں معاون ضرور ہے، لہٰذا ہمیں ان کتابوں کی تدریس میں یہ چیزیں پیش نظر رکھنی چاہئے۔

اوپر بات قدرے تفصیل سے سامنے آچکی ہے، اس لیے یہاں بس اشارے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱).....عمومی ہدایات میں ہدایت نمبر ۱، ۲ اور ۳ میں حفظ لغات وتعبیرات، جہری قراءت کا اہتمام اور گھنٹے کی ترتیب بنانے کے تعلق سے جو باتیں کہی گئی ہیں انہیں پیش نظر رکھا جائے۔

(۲).....لغات لکھوانے کے سلسلے میں القراءة الواضحة کے طریقہ تدریس کے سلسلے میں ہدایت نمبر ۴ میں تفصیلی معروضات پیش کی گئی ہیں، ان دونوں کتابوں میں لغات لکھواتے ہوئے ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۳).....ترجمہ کے تعلق سے ضروری تفصیل القراءة الواضحة کی طریق تدریس کے بیان کے ضمن میں ہدایت نمبر ۹ میں آئی ہیں ترجمہ میں اس کا لحاظ کیا جائے، البتہ یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے، کہ القراءة الواضحة کی عبارت کے بنسبت نفحة الأدب کی عبارت قدرے مشکل اور نفحة العرب کی عبارت اس سے زیادہ مشکل ہے، اسی مشکل کو محسوس کرتے ہوئے مولانا وحید الزماں صاحب نے نفحة الأدب کی شرح میں ترجمہ

کے تعلق سے خاصی تفصیلی ہدایات دی ہیں اور یہی چیز اردو ترجمہ لکھنے کی بھی محرک ہوئی ہے،لہٰذا استاذ کو یہ ہدایات دیکھنی چاہییں ،اور مولانا کے ترجمے سے بھی استفادہ کرنا چاہیے، جہاں سلیس اردو میں ترجمہ طلبہ کے لیے مشکل ہو وہاں پہلے لفظی ترجمہ سمجھا دیا جائے ، پھر سلیس ترجمہ بتایا جائے ،اور اگر اس کے بعد بھی سلیس ترجمہ میں طلبہ کو دشواری ہو تو پھر جہاں جہاں دشواری ہو وہاں لفظی ترجمہ ہی کرایا جائے ، یہی طریقہ **نفحة العرب** میں بھی رکھا جائے۔

(۴).....یہ دونوں کتابیں اصلاً تو ریڈنگ کی ہیں؛لیکن **نفحة الأدب** میں مؤلف کی خواہش ہے کہ طلبہ سبق سے سوالات اخذ کر کے تمرینات بھی کریں،مگر نصاب کے طویل اور وقت کے تنگ ہونے کے سبب اس کی گنجائش عموماً نہیں بن پاتی ،لیکن اگر کوئی اس کے لیے وقت نکال سکے تو طریقہ تمرین مؤلف کی اردو شرح کے مقدے سے معلوم ہو جائے گا،**القراءة الواضحة** کے طریق تدریس میں ہدایت نمبرے سے بھی رہنمائی مل سکتی ہے۔

(۵).....نفحۃ العرب کی نثر عام طلبہ کی سطح سے بلند ہے، پھر انشا اور ادب کی کتابوں میں جو منہجیت اور تدریج ہوتی ہے کہ آہستہ آہستہ نثر کا معیار بلند ہوتا ہے وہ بھی یہاں نہیں ہے،قدیم ادبی کتابوں سے تراشے تدریج کا لحاظ کئے بغیر جمع کر دئے گئے ہیں،ان اسباب کی وجہ سے کتاب طلبہ کو مشکل معلوم ہوتی ہے، پھر نصاب بھی خاصا ہے،لہٰذا استاذ کو چاہیے کہ پورا گھنٹہ دے، کتاب توجہ سے پڑھائے اور اسباق کو سننے کا خصوصی اہتمام کرے، کتاب میں ذکر کردہ حکایتیں اور ان میں مذکور شخصیات بھی نامانوس ہوتی ہیں اس کی وجہ سے بھی طلبہ کتاب سے متوحش ہوتے ہیں،استاذ کو چاہیے کہ سبق شروع کرنے سے پہلے اس میں ذکر کردہ حکایت یا لطیفے کو پہلے اپنی زبان میں بیان کر دے، پھر سبق پڑھائے ،ان شاء اللہ اس سے انسیت بڑھے گی اور دلچسپی پیدا ہوگی۔

اللہ تعالی ان معروضات کو مفید و نافع بنائے ،اور ہم سبھی کو احساس ذمہ داری اور فکر مندی کے ساتھ طلبہ کو پڑھانے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

وللّٰه الحمد أولا وآخرا،وما توفيقي إلا باللّٰه،عليه توكلت وإليه أنيب.

☆.....☆.....☆

تحریک استشراق اور ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی

محمد احمد حافظ

استشراق (orientalism) اور مستشرقین دو اصطلاحیں ہیں۔انگریزی زبان وادب میں ان کا استعمال مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا۔ڈاکٹر احمد عبدالحمید غراب نے اپنی کتاب ''رؤیۃ اسلامیۃ للاستشراق'' میں استشراق کی جو تعریفات کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مغربی ممالک کے استعماری فکر کے حامل اسکالرز اپنی نسلی برتری کے نظریہ کی بنیاد پر مشرق پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اس کی تاریخ، تہذیب، ادیان، زبانوں، سیاسی اور اجتماعی نظاموں، ذخائر، دولت اور امکانات کا ''غیر جانبدارانہ تحقیق'' کے عنوان سے مطالعے کا نام ہے، جس کا مقصد مشرق اسلامی میں اپنی نسلی برتری کے زعم میں مسلمانوں پر اہل مغرب کا تسلط قائم رکھنا اور اسلام کے بارے شکوک وشبہات پھیلا کر اسلام کو مسخ صورت میں پیش کرنا ہے۔

دراصل تحریک استشراق اسلام کے راستے میں بند باندھنے کی کوششوں کا ہی حصہ ہے۔مستشرقین کے علوم اسلامیہ کی طرف متوجہ ہوتے وقت اپنی تہذیب کے حوالے سے درج ذیل مقاصد تھے:

☆.....اسلام کی حقانیت اور اسلام کے ساتھ اہل اسلام کی جذباتی لگاؤ کو کم کرنے کے لیے مناسب دلائل تلاش کرنا۔

☆.....اقوام عالم میں اسلام کے پھیلاو کو روکا جائے اور مشنری سرگرمیوں کو منظّم اور مربوط کیا جائے۔

مستشرقین کے علمی اور تحقیقی کاموں کے پیچھے اکثر وبیشتر علم کی خدمات کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا بلکہ علم کی خدمت کی آڑ میں اسلام سے مقابلہ کیا جاتا ہے، لیکن یہ اصول تمام مستشرقین پر لاگو نہیں ہوتا۔ان میں بعض ایسے لوگ بھی موجود رہے ہیں جن کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے صرف علم کے حصول اور علم کی خدمت کے جذبے سے اپنی زندگیاں تحقیق کے خارزار میں گزار دیں۔اسلامی موضوعات پر ان کے قلم سے ایسی باتیں نکلی ہیں جن میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق منصفانہ رویہ اختیار کیا گیا۔گو ان کی تحریروں میں بہت سی غلط باتیں بھی ہیں لیکن اس کی وجہ یہ

ہے کہ ایک آدمی مسلمان نہ ہو اور اس کے پیش نظر کتابوں کا وہ ذخیرہ ہو جو اسلام کے متعلق زہریلے پروپیگنڈے سے پُر ہو، اس آدمی سے اس قسم کی غلطیوں کا صدور ہونا عجیب نہیں۔

علمی اور دینی مقاصد کے ساتھ ساتھ تجارتی اور مالی مقاصد بھی مستشرقین کے پیش نظر تھے۔ جن کی وجہ سے وہ مشرقی زبانوں اور مشرق کے دیگر حالات کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اہل مغرب خصوصاً اٹلی کے لوگوں کے مشرقی ممالک کے ساتھ قدیم تجارتی تعلقات تھے۔ اہل مشرق کے ساتھ اپنے تجارتی معاملات کو اچھے طریقے سے طے کرنے کے لیے انہوں نے عربی زبان کی تعلیم کو ضروری سمجھا۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ 1265ء میں تونس اور اٹلی کے شہر پیرا کے تاجروں کے درمیان میں جو تجارتی معاہدہ ہوا اسے عربی زبان میں لکھا گیا۔ لیکن مستشرقین کا ایک بڑا طبقہ معاندین کا تھا جن کا مقصد بے لاگ اور غیر جانبدارانہ علمی تحقیق کے لبادے میں اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانا تھا۔ ان میں جین برڈ، ہمفرس پرائی ڈیکس، سر ولیم میور، جارج سیل اور گولڈزیہر سرفہرست ہیں۔

سب سے پہلا مستشرق ساتویں صدی عیسوی کا عیسائی پادری جان (john) تھا۔ اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس بارے جھوٹی باتیں گھڑیں اور شرم ناک افسانے تراشے۔ بعد میں 'جان' کی یہ خرافات دیگر عیسائی پادریوں، یہودی ربیوں اور استشراقی علماء کا ماخذ ومصدر بن گئیں۔ مستشرقین نے سیرت النبی کو ایک خاص زاویے سے پرکھنے کی کوشش کی، تعدد ازدواج پر اعتراضات اٹھائے، غلامی پر اپنے فاسد خیالات کا طومار باندھا، جہاد کی غلط توجیہہ کرکے اسے ظلم اور جبر سے تعبیر کیا، قرآن پاک کے کلام اللہ ہونے کو بہ زعم خود چیلنج کیا، حدیث، فقہ اور تاریخ کے قدیم ماخذات میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بہ ظاہر عربی زبان کی علمی لغات پر تحقیقی کام کیا مگر جا بجا ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہوئے معنیٰ ومطالب گڈمڈ کرتے گئے۔

مسلم معاشروں سے جو لوگ یورپی جامعات میں اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے ان کے ذہنوں میں اسلامی تراث اور مسلم تاریخ کے حوالے سے شکوک وشبہات کے بیج بوئے۔ جب یہ لوگ واپس اپنے ملکوں میں آئے تو انہوں نے مسلم ممالک کی جامعات میں نوجوان ذہن میں اپنے فاسد خیالات انڈیلنے شروع کردیے، مصر ان مغرب پسندوں کا اوّلین کا مرکز تھا۔ وہاں کے معروف اہل قلم (مثلاً طٰہٰ حسین) استشراقی اور اباحی تحریکوں کے آلہ کار بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے مستشرقین کے افکار کو نہ صرف من وعن قبول کیا بلکہ ان کے ژولیدہ افکار کی بنیاد پر معذرت خواہانہ علمیت کی عمارت کھڑی کی، مستشرقین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مسلمانوں کی علمی تراث اور تاریخ میں تشکیک کے پیوند لگائے۔

مسلمانوں کی جانب سے مستشرقین کے آگے جن لوگوں نے مضبوط بند باندھا ان میں ایک بڑا نام ڈاکٹر مصطفیٰ

حسنی السباعی کا ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی علمی حلقوں میں تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ داعی، مجاہد فی سبیل اللہ، عالم، محقق، مصنف اور بے مثل ادیب وخطیب تھے۔ آپ نے جس دور میں شعور کی آنکھ کھولی وہ عالم اسلام میں علمی، سیاسی، معاشرتی اور جغرافیائی کشمکش کا دور تھا۔ مسلم خطے انگریزی، فرانسیسی اور روسی استعمار کے مقبوضات میں شامل ہو چکے تھے۔ مسلم معاشروں میں تنصیری، تبشیری اور استشراقی تحریکیں عروج پر تھیں۔ تنصیری اور تبشیری تحریکیں عوام میں کام کر رہی تھیں، جبکہ استشراقی تحریکیں مسلمانوں کی علمی تراث میں نقب لگا رہی تھیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی مرحوم کو زمانہ طالب علمی (۱۹۴۹ء) میں متشرقین سے براہ راست واسطہ پڑا۔ آپ نے مستشرقین کے طریقہ واردات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے ڈاکٹر حسن عبدالقادر صاحب کے ساتھ اپنے کالج کے دور کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ جو مسلمانوں کے مغرب زدہ طبقے کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ علی حسن عبدالقادر صاحب جرمنی سے نئے نئے پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے۔ جامعہ ازہر میں شیخ مراغی کے دور میں انھیں ہمیں ''تاریخِ تشریعِ اسلامی'' پڑھانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر سباعی مرحوم لکھتے ہیں کہ حسن عبدالقادر صاحب کی پہلی گفتگو کچھ اس طرح تھی کہ:

''میں تمھیں تاریخِ تشریعِ اسلامی ایسے منفرد علمی انداز سے پڑھاؤں گا جس سے ازہر کا کوئی واسطہ بھی نہیں ہوگا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ازہر میں چودہ سال پڑھا ہے مگر اسلام مجھے سمجھ نہیں آیا۔ میں نے اسلام کو جرمنی میں طالب علمی کے زمانے میں سمجھا''۔

ہم طلبہ عالم حیرت میں آپس میں کہتے کہ شاید ہمارے استاد صاحب کوئی ایسی بات جرمنی سے لائے ہوں جس سے ازہر کا کوئی تعلق نہ ہو! بہرحال؛ انھوں نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب سے ترجمہ کرتے ہوئے سنت نبوی کی تاریخ پڑھانی شروع کی۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ گولڈ زیہر (Ignác Goldziher) کی ''دراساتِ اسلامیہ'' ہے جس کی عبارات نقل کر کے ہمارے استاد صاحب اس سے علمی حقائق باور کراتے ہیں۔ بہرحال اس طرح سلسلہء درس جاری رہا اور ہم طلبہ اپنے مبلغِ علم کی حد تک ان کے ساتھ مناقشہ بھی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے امام زہری رحمہ اللہ پر امویین کے لیے حدیث گھڑنے کا الزام لگا دیا۔ ہم نے عرض کیا کہ وہ تو سنت کے امام ہیں، علماء کا مرجع ہیں، مگر وہ اپنی بات پر مصر رہے۔ آخر کار میں نے ان سے گولڈ زیہر (Ignác Goldziher) کی امام زہری سے متعلق پوری تحقیق کا ترجمہ کرنے کا مطالبہ کیا جسے استاد صاحب نے منظور کیا اور متعلقہ حصہ دو، ورقوں میں ترجمہ کر کے مجھے دیا۔ اب میں مختلف مکتبوں میں جا کر امام زہری کی سیرت اور اس مستشرق کے لگائے گئے الزامات کی تحقیق کرتا رہا۔ اس دوران مکتبہ ازہر اور دارالکتب المصریہ میں کوئی کتاب یا مخطوطہ نہیں

چھوڑا، جس میں سے میں نے امام زہری سے متعلقہ مواد جمع نہ کیا ہو۔ میں کالج کے سبق کے اوقات کے بعد سے رات گئے تک اس کام میں مشغول رہتا، یہاں تک کہ تین ماہ گزر گئے۔ جب پوری معلومات جمع ہوگئیں تو میں نے اپنے استاد صاحب سے عرض کیا کہ گولڈزیہر نے امام زہری سے متعلق عبارات میں تحریف کی ہے اور ان کی عبارات نقل کرنے میں خیانت سے کام لیا ہے، مگر جناب استاد کا جواب تھا: ''مستشرقین اور خصوصاً گولڈزیہر انصاف پسند لوگ ہیں، وہ نصوص اور حقائق میں تبدیلی نہیں کر سکتے۔''

تب میں نے جمعیۃ الھدایۃ الاسلامیہ میں اس موضوع پر محاضرے کا اہتمام کیا۔ ادارے نے ازہری علماء اور طلبہ کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ حاضری بھرپور رہی۔ اپنے استاذ حسن عبدالقادر صاحب کو بھی میں نے شرکت کی دعوت دی اور اپنی معروضات پر رائے کے اظہار کی درخواست کی تھی، چناں چہ انہوں نے دعوت قبول کر لی اور تشریف لے آئے۔ جب میں نے گفتگو کا اختتام ان الفاظ میں کیا:

''اس مسئلے میں میری یہ رائے ہے اور یہی رائے ہمارے علماء کی بھی ہے، اگر ہمارے استاذ حسن عبدالقادر صاحب اس پر مناقشہ کرنا چاہتے ہیں تو ان سے تشریف آوری کی درخواست ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے اسٹیج پر تشریف لاکر برسر مجلس فرمایا:

''میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نہیں جانتا تھا کہ زہری کون ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ میں نے زہری کو ابھی پہچانا ہے، مجھے آپ کی معروضات پر کوئی اعتراض نہیں''۔ اور مجلس برخواست ہوگئی۔''

بلاشبہ آپ زمانہ طالب علمی میں ہی مستشرقین علمی خیانتوں کو بھانپ گئے تھے اور ان کی علمی کمزوریاں بھی طشت از بام ہوگئی تھیں۔ جس کی تصدیق بعد کی علمی تحقیقات نے بھی کی۔ اس ضمن میں آپ نے بہت کچھ تصنیف کیا۔ آپ نے امت کو اَلسُّنَّةُ وَمَكَانَتُهَا فِي التَّشْرِيعِ الْإِسْلَامِيِّ کا گراں قدر تحفہ دیا۔ آپ کی یہ کتاب حدیث وسنت کے دفاع میں عظیم الشان تصنیف ہے۔ یہ کتاب جہاں منکرین حدیث کا دَندان شکن جواب ہے وہیں مستشرقین کا بھی گراں قدر علمی رد ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں اپنے دور کے مستشرقین اور مستغربین کے پھیلائے جال کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے فقہ اسلامی میں حدیث وسنت کے مقام ومرتبے کو بحسن وخوبی دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے، نیز اس پر بحث کی ہے کہ حدیث کن تاریخی مراحل سے گزر کر موجودہ مقام تک پہنچی اور علماء نے اس کی حفاظت وصیانت کے لیے کیا کیا خدمات انجام دیں؟!۔ جن لوگوں نے فن حدیث کو ہدف تنقید بنایا ان کا پروقار انداز میں علمی رد کیا۔ جرح وقدح کے لیے وہ انداز اختیار کیا کہ حق بھی واضح ہوجائے اور سنت مطہرہ کا چہرہ اپنی تمام تر

تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوجائے۔ یہ کتاب محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نوراللہ مرقدہ نے خاص اہتمام کے ساتھ ''اسلام میں سنت وحدیث کا مقام'' کے نام سے ترجمہ کرواکے شائع کی ۔ترجمہ حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔ جو آج بھی اہل علم کے ہاں متداول ہے۔

آپ کی دوسری کتاب **المستشرقون، مالهم وماعليهم** ہے، آپ کی یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر اپنے مفاہیم میں کئی ضخیم کتابوں پر بھاری ہے۔ اس کتاب میں آپ نے استشراق کی تاریخ، محرکات، اہداف اور مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے معروف مستشرقین اور ان کی کتابوں کا تعارف بھی کرایا ہے، اسی طرح ہمارے معاشروں کے عصری تعلیم یافتہ لوگوں کے مستشرقین سے متاثر ہونے کی وجوہ بھی ذکر کی ہیں۔ غرض مصنف نے اس موضوع پر حتی الامکان کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا، اس کا اندازہ کتاب کی فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ شیخ مصطفیٰ سباعیؒ نے اپنی کتاب میں متشرقین کے کام کی نوعیت اور مقاصد کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مستشرقین کے پیش نظر:

۱.....اسلام کے بارے میں بدگمانی پیدا کرنا۔

۲.....عام مسلمانوں کو مسلم علماء سے بدظن کرنا۔

۳.....ابتدائی مسلم معاشرے کی غلط تصویر کشی کرکے مسلمانوں کی تاریخ مسخ کرنا۔

۴.....اسلامی تہذیب کی تحقیر کرنا۔

۵.....کتاب وسنت میں تحریف کرنا، عبارتوں کو غلط مفہوم میں پیش کرنا، اور حسب خواہش قبول یا رد کرنا۔

شیخ مصطفیٰ السباعی مرحوم کے صاحبزادے جناب حسان مصطفیٰ السباعی کے بقول اس کے کچھ حصے **حضارة الاسلام اور السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي** میں شائع ہو چکے تھے۔ شیخ مصطفیٰ کا خیال تھا کہ اس میں مزید اضافے کیے جائیں مگر موت نے انہیں مہلت نہیں دی اور وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ استشراقی فکر کے تعاقب میں آپ کی ایک اور کتاب **حول راية في الاستشراق** کے نام سے ہے۔

بلاشبہ شیخ مصطفیٰ رحمہ اللہ علم وعمل؛ دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ انہوں اپنی تحریروں کے ذریعے امت کا اپنی تہذیب وتراث پر اعتماد بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسلامی اور دینی تشخص پر فخر کرنا سکھایا۔ اور مسلمانوں کے علوم پر مستشرقین کی اڑائی ہوگرد صاف کرکے اس کی حقیقی شکل وصورت سامنے لائے۔ آپ نے استشراق کے تعارف اور تعاقب میں گراں قدر علمی ذخیرہ چھوڑا۔ وہ اہل علم وتحقیق کے لیے ایسے جادہ مستقیم کی نشان دہی کرگئے جس پر چلتے ہوئے بعد کے علماء حق مستشرقین کا مضبوط علمی تعاقب جاری رکھ سکتے ہیں۔

بظاہر خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ دور میں مستشرقین کا زور کم پڑ گیا ہے اور ان کا کام طاق نسیاں پہ چلا گیا ہے، ایسا نہیں ہے؛ بلکہ استشراقی فکر کی لہریں رنگ و آہنگ کے فرق کے ساتھ پہلے سے زیادہ توانا ہو کر اب بھی جاری و ساری ہیں۔ ہماری یونیورسٹیاں اس فکر کی پناہ گاہیں ہیں۔ ان جامعات کے پی ایچ ڈی ڈاکٹرز اور پروفیسرز استشراقی ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہماری علمی تراث کو منہدم کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ سوشل میڈیا کی عمومیت نے اس حوالے سے جلتی پہ تیل کا کام کیا ہے۔ ہمارے کم فہم نوجوان اور مدارس کے ناقص علم رکھنے والے بعض فضلاء بہت آسانی سے مستغربین کے جال میں آجاتے ہیں۔ نیوٹرے ڈیم یونیورسٹی امریکا کی سرپرستی میں چلنے والا ''مدرسہ ڈسکورس پروگرام'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس پروگرام کے تحت ایک تسلسل سے نیپال میں کورسز ہو رہے ہیں، جن میں ہمارے مدارس کے آزاد خیال فضلاء کو شریک کیا جاتا ہے۔ جہاں شرکاء کے لیے مرد و زن کا مخلوط ماحول فراہم کیا جاتا ہے۔ انہیں تعلیمی تحقیق کے نام پر خلوت و جلوت کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔

اس لیے اس موضوع پر کام کی ضرورت جیسے کل مسلّم تھی آج بھی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ علماء امت اور طلبہ کرام مستشرقین، ملحدین اور متجددین کے کام اور طریقہ واردات کو سمجھیں، ان کے تشکیک زدہ خیالات کو جدید اصول تحقیق و تصنیف کی روشنی میں رد کریں، یہ کام دینی مدارس کے وابستگان ہی کر سکتے ہیں۔

آخر میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے، آپ لکھتے ہیں:

''مستشرقین نے استشراق کی تحقیقی نقاب چہروں پر ڈال کر وہی کام کیا ہے جو ان کے باپ دادا بھونڈے انداز میں کرتے تھے۔ اس باب میں قطعاً دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ دشمن معصومیت کے دعووں کے ساتھ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اس کا جواب اسی رنگ میں دینا چاہیے۔ یورپ والے پہلے سے نصب العین کو معین کر کے ریسرچ کرتے ہیں اور صرف انہی باتوں کو چنتے اور اجاگر کرتے ہیں جن سے اپنے نصب العین کی تائید میں مدد ملتی ہے۔ ہمارا فرض بھی یہ ہونا چاہیے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین مبین کی حمایت میں جن معلومات سے بھی مدد مل سکتی ہو ان کو ڈھونڈنا اور تلاش کرتے رہنا چاہیے۔ شاید لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ کا وقت جب آئے تو مصر کی بڑھیا غریب کو اپنے کاتے ہوئے دھاگوں کو ہی لے کر یوسف کے خریداروں میں شریک ہونے کا موقع مل جائے۔''

(مجموعہ خطوط گیلانی۔ ص: ۴۷۹۔ ط: مکتبہ عمر فاروق کراچی)

امام القراء حضرت مولانا قاری محمد علی مدنی نوراللہ مرقدہ

مولانا حسن خلیل مدنی

سرزمین سندھ بڑی مردُم خیز ہے، اس کی کوکھ سے بے شمار عظیم شخصیات نے جنم لیا، جنہوں نے خطے میں علم و دانش کے ایسے چراغ روشن کیے جن سے علم و عرفان کی کرنیں پھوٹیں، اور چہار دانگ عالم کو منور کیا۔ انہیں میں حامل قرآن، امام القراء حضرت مولانا سائیں قاری محمد علی مدنی صاحب نوراللہ مرقدہ ہیں، جن کی ولادت باسعادت تحصیل خیر پور میں دریائے سندھ کے ساحل پر واقع پھلونامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔

امام القراء حضرت مولانا سائیں قاری محمد علی مدنی صاحب نوراللہ مرقدہ ایک سال کے تھے کہ آنکھوں کی بینائی اللہ تعالی نے واپس لے لی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے سے حاصل کی، بچپن سے ہی آپ کے سینے میں مدینۃ المنورۃ میں تعلیم حاصل کرنے کی تڑپ تھی۔ کچھ سالوں کے بعد بالآخر آپ کا مدینۃ المنورۃ جانے کا خواب مکمل ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں ۱۳ سال کی عمر میں آپ نے مدینۃ المنورہ کی طرف پیدل سفر کا آغاز کیا، اس سفر کے دوران بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کبھی قافلہ ملتا تو کبھی تنِ تنہا، کبھی پہاڑ و جنگلات تو کبھی صحرا و بیابان، لیکن بالآخر اللہ تعالی کی مدد و نصرت سے یہ مشکل سفر دَس ماہ میں مکمل ہوا۔

آپ نے مدینۃ منورۃ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ ایام گذارنے کے بعد باب السلام کے بالکل متصل قائم مدرسہ تحفیظ القرآن میں فضیلۃ الشیخ المقرء السید عباس انعام بخاری رحمہ اللہ علیہ کے پاس علم تجوید کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد مسجد نبوی میں روضہ اقدس کے سائے تلے استاذ الاساتذہ فضیلۃ الشیخ حسن بن ابراہیم الشاعر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس قراءاتِ عشرۃ کا علم حاصل کیا، آپ نے علم قراءات عشرۃ کے ساتھ ساتھ علم الاوقاف، علم رسم الخط، علم النحو اور حدیث و تفسیر کے علوم کی تکمیل فرمائی۔

آپ کی علماء دیوبند سے رفاقت مدینۃ المنورۃ میں ہی آپ کے استاد فضیلۃ الشیخ المقرء السید عباس انعام بخاری رحمہ اللہ علیہ کے توسط سے ہوئی، علماء دیوبند میں سے امام الاولیاء شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری، مجاہد ملت

حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حافظ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ، محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، شیخ المنطق والفلسفہ حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ (دیوبند) مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع عثمانیؒ و دیگر اکابرین سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

فراغت کے بعد آپ نے وہیں الحرم النبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پڑھانا شروع کیا جہاں آپ کے پاس سعودی عرب کے مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ پاکستان، مصر اور مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والوں نے تعلیم حاصل کی۔ ایام حج کے مواقع میں ہندوستان اور پاکستان سے آئے ہوئے علماء آپ کے پاس تعلیم حاصل کرتے تھے، جن میں شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزق اسکندرؒ و دیگر بھی شامل ہیں، دو سال وہاں پڑھانے کے بعد ظاہراً اپنے استاد کے حکم سے، لیکن درحقیقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ۱۹۶۴ء میں پاکستان تشریف لائے، پاکستان تشریف لانے کے بعد شکار پور سندھ میں واقع مدرسہ عربیہ اشرفیہ میں ۶ رسال پڑھایا، اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں شکار پور میں ہی دارالقراءت نام سے مدرسہ قائم کیا۔

جب طلبہ کی تعداد زیادہ بڑھ گئی، اور مدرسہ دارالقراءت کی تعمیرات ناکافی ہوگئیں تو آپ کو ایک وسیع مدرسہ قائم کرنے کا خیال آیا، اس لئے آپ نے ۲۰۰۳ء میں شکار پور میں ہی ایک عالیشان مدرسہ تعمیر کروایا، جس کا سنگ بنیاد بدست قائد جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدظلہ العالیہ رکھا گیا، اور اس مدرسہ کا نام جامعہ مدنیہ تجویز کیا گیا۔

آپ کے پاس پاکستان سمیت مختلف ممالک سے ہزاروں طلبہ علوم قرآن سے فیض یاب ہوئے، جن میں سرفہرست استاد القراء ابوالخلیل امیر الدین انورؒ، الشیخ المقری ءابومحمد عبدالمالک سلطان محمود (مکۃ المکرّمۃ)، شیخ القراء قاری محمد عالم عباسیؒ، قاری بشیر احمد نور محمد (مدینۃ المنورۃ) قاری اللہ بخش محمد (مدینۃ المنورۃ) قاری عبدالمجید لاکھوؒ (جدہ) قاری بشیر احمد سلطانؒ، قاری غلام رسول، قاری گل محمد ملک، قاری شمس الدین عباسیؒ، قاری نذیر احمد مالکی، قاری ولی محمد عالمانی، قاری عبدالرحمٰن، قاری جاوید احمد و دیگر شامل ہیں۔

پاکستان تشریف لانے کے بعد آپ نے دو مرتبہ پاکستان چھوڑ کر مدینۃ المنورۃ کی طرف ہجرت کرنے کا مصمم ارادہ فرمایا اور اپنی طرف سے انتظامات مکمل کر لیے، لیکن روانگی سے کچھ ایام پہلے اچانک مجھ کو اٹھتے ہی اپنا ارادہ ترک کرنا ظاہر فرمایا اور آپ نے بڑے اصرار کے بعد بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ پاکستان میں رہ کر ہی اپنی خدمات سرانجام دیں۔

امام القراء حضرت مولانا سائیں قاری مدنی صاحب نوراللہ مرقدہ کا نکاح اپنی چچا کی بیٹی سے ہوا۔ جن سے دو بیٹے

قاری مجیب الرحمٰن مدنی، قاری الطاف الرحمٰن مدنی اور ایک بیٹی ہوئیں۔

آپ جسمانی صفتوں کے اعتبار سے اچھے درمیانہ قد کے تھے۔ پیشانی چوڑی، گندمی رنگ، اور ہنس مکھ چہرے کے مالک تھے، فطرۃً قوی اور باوقار تھے۔

امام القراء حضرت مولانا سائیں قاری محمد علی مدنی صاحب نور اللہ مرقدہ نے مسلسل ساٹھ سال امت کی بے لوث اور بے نظیر خدمات سرانجام دیں، آپ کے شاگرد صرف پاکستان میں نہیں بلکہ دنیا کے کونے کونے میں علم دین کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

۵ جولائی ۲۰۲۲ء بمطابق ۵ ذی الحجہ ۱۴۴۳ھ بروز منگل دوپہر ایک بجے کے قریب بالآخر دستور خداوندی کے مطابق علم وعمل اور زہد وتقوی کا یہ آفتاب ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہزاروں عقیدت مندوں نے آپ کے جانشین مولانا قاری مجیب الرحمٰن مدنی کی امامت میں آپ کی نماز جنازہ پڑھی، اور آپ کی تدفین آپ کی درسگاہ جامعہ مدینہ شکارپور میں عمل میں آئی۔

دستورِ خداوندی کے مطابق اللہ تعالی نے جس کے لیے جتنی سانسیں مقدر کردی ہیں، تو ان میں کمی ہوتی ہے نہ زیادتی، جو انسان دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، تو اس کی واپسی کا دن معین ہوتا ہے، لیکن بہت سے جانے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے جانے سے ایک جہان تاریک ہوجاتا ہے، زمین وآسمان ان پر نوحہ کرتے ہیں، ہر سو صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔

امام القراء حضرت مولانا سائیں قاری محمد علی مدنی صاحب نور اللہ مرقدہ چلے گئے مگر انہوں نے اپنے پیچھے صرف اپنی اولاد کو ہی یتیم نہیں چھوڑا بلکہ ہزاروں طلباء اور لاکھوں عقیدت مندوں کو یتیم کر گئے، اساتذہ، طلباء ماتم کناں ہیں، کہ ان کے مربی، ان کے سرپرست چلے گئے، لیکن یہ موقع حسرت وافسوس کا نہیں صبر احتساب سے کام لینے اور بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کے عزم مصمم کرنے کا ہے۔

پروردگار عالم ہمیں بھی حضرت کے علوم ومعارف کا کچھ حصہ نصیب فرمائے، اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!۔

☆.....☆.....☆

حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مولف: مولانا ابوالحسن الصغیر بن مولانا محمد صادقؒ سندھی۔ مترجم: مولانا مفتی محمد خالد۔ صفحات: ۱۵۲۔ طباعت: مناسب۔ قیمت: ۲۲۰ روپے۔ ملنے کا پتا: جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ ہالا، سندھ۔ رابطہ نمبر، 0331284602

حیات انبیاء خصوصاً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات برزخی امت کا اجماعی عقیدہ ہے۔ اس کے اثبات پر مختلف زمانوں میں علماء امت نے رسائل اور کتابیں تالیف کی ہیں۔ ''حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' علامہ ابوالحسن غلام حسین بن مولانا محمد صادق سندھی رحمہ اللہ کے عربی رسالے ''انباء الانباء فی حیاۃ الانبیاء'' کا اردو ترجمہ ہے۔ علامہ ابوالحسن الصغیر بن محمد صادق ۱۱۳۵ھ میں ٹھٹہ میں پیدا ہوئے، یہیں پر مروجہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حرمین شریفین چلے گئے جہاں آپ شیخ محمد حیات سندھی کے درس میں شریک ہوئے۔ بعد ازاں مسجد نبوی شریف میں مدرس بھی ہوئے۔ آپ مذہباً حنفی اور سلوکاً نقشبندی تھے۔ اپنے وقت کے کبار علماء ومحدثین میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ آپ کے والد گرامی مولانا محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ نقشبندی سلسلے کے معروف بزرگ تھے، اور خطہ سندھ میں ان کا خاص احترام پایا جاتا تھا۔ انباء الانباء فی حیاۃ الانبیاء میں مولانا ابوالحسن الصغیرؒ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برزخی حیات کو بدلائل ثابت کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ منفرد رسالہ ہے۔ عربی میں ہونے کی وجہ سے اردو داں طبقہ اس رسالے کے افادہ سے محروم تھا۔ دارالعلوم الاسلامیہ ھالا کے مہتمم حضرت مولانا مفتی محمد خالد صاحب زید مجدہم (رکن مجلس عاملہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان) نے اس کا اردو ترجمہ کرکے افادۂ عام کے لیے شائع کیا ہے۔ آغاز میں مولانا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی سندھی رحمہ اللہ کا وقیع تعارفی مقدمہ بھی شامل ہے۔ طباعت عمدہ ہے، البتہ بعض تسامحات آ گئے ہیں جن کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اہل علم کے لیے گرانقدر تحفہ ہے۔

انوار السنۃ

تالیف: مولانا مفتی ہدایت الرحمٰن۔ صفحات: 305۔ طباعت: مناسب۔ ملنے کا پتا: امام اعظم ابوحنیفہ اسلامک ریسرچ سینٹر باجا (کے پی کے) 0301-5372357

حدیث پاک کی خدمت تدریس وتعلیم کی صورت میں ہو یا تالیف وتصنیف کی شکل میں؛ قابل مبارک باد مشغلہ ہے۔ مولانا مفتی ہدایت الرحمٰن (فاضل دارالعلوم کراچی) نے معارف الحدیث کی طرز پر احادیث کی تشریح وتوضیح اور

دور حاضر کے مسائل کی تطبیق کا بیڑہ اٹھایا ہے، اور ایک عمدہ کاوش منظر عام پہ لائے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض ابواب قابل توجہ ہیں مثلا کتاب الایمان کے تحت باب التقلید، باب البدعۃ، باب خاتم النبیین، باب التعویذات، باب التامین بالسر، یا کتاب الکبائر کے تحت باب الرشوۃ، باب الاجتناب عن اللواطۃ، اسی طرح کتاب المعفرقات کے تحت باب التبلیغ، باب الاصلاح بین الناس، باب التصاویر وغیرہ۔ ان عنوانات کے تحت بھی احادیث لاکر ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے، اسلوب عمدہ ہے اور درس حدیث کے لیے یہ کتاب مناسب ہے۔ آغاز میں شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ کے دعائیہ کلمات شامل ہیں۔

فن تدوین وتصنیف

مولف: جناب حامد محمود راجا۔ صفحات: 208۔ طباعت: مناسب۔ قیمت: 350 روپے ملنے کا پتا: دارالبیان لاہور 0301-4421157

مولوی اور تصنیف وتالیف کا چولی دامن کا ساتھ ہے، کتب خانوں کی آبرو صاحبِ تصنیف علماء کے دم سے قائم ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تصنیف وتالیف کے اپنے کچھ معیارات ہیں۔ دور حاضر میں بیروت اور دمشق وغیرہ سے چھپنے والی کتابوں کو ملاحظہ کیا جائے تو ان معیارات کا کچھ اندازہ ہو پاتا ہے۔ جناب مولانا حامد محمود راجا صاحب نے اسی سلسلے میں 'فن تدوین وتصنیف' کے عنوان سے کتاب تالیف کی ہے، مگر عنوان سے یہ مت سمجھیے کہ اس میں کتاب تصنیف کرنے کے بارے میں کچھ ٹوٹکے ذکر کیے ہوں گے۔ مؤلف نے اپنی کتاب کے اندرونی سرورق پر خود ہی وضاحت کردی ہے کہ ''زیر نظر کتاب آپ کو یہ نہیں سکھلائے گی کہ ایک بہترین کتاب کیسے لکھی جاتی ہے بلکہ کتاب آپ کو یہ سکھلائے گی کہ ایک بہترین جملہ کیسے لکھا جاتا ہے؟

یہ بنیادی بات ہے؛ کتاب کی تصنیف وتالیف سے قبل تحریر وجود میں آتی ہے۔ تحریر کیسے لکھی جائے؟ یہ بنیادی نکتہ ہے۔ بقول مولف: ''نوآموز مصنف اور محقق کے لیے تدوین پہلی سیڑھی ہے، جیسے ناظرہ قرآن کے لیے نورانی قاعدہ پڑھنا ضروری ہے ایسے ہی فن تحریر میں پختگی اور نکھار پیدا کرنے کے لیے لازم ہے کہ تحریروں کی نوک پلک سنواری جائے۔ جناب حامد محمود راجا صاحب نے اپنی کتاب کے لیے تفسیر جلالین اور تفسیر بیان القرآن (للتھانویؒ) کو بنیاد بنایا ہے، دونوں تفسیریں اختصار اور جامعیت کا شاہکار ہیں۔ اختصار اور جامعیت کو ایک ساتھ ملحوظ رکھنا آسان بات نہیں، بڑی عرق ریزی کا کام ہے۔ بہر حال مولانا حامد محمود راجا صاحب نے پہلے قدم کے طور پر مصنف بننے کے خواہش مندوں کو تحریری اسلوب سکھانے کی سعی کی ہے، اس سلسلے میں انہوں نے تفسیر جلالین اور بیان القرآن سے

لے کر اخبارات میں چھپنے والی خبروں اور تجزیوں تک کو بطور مثال پیش کیا ہے کہ ایک خوب صورت جملہ اور عمدہ تحریر کیسے وجود میں آتی ہے۔تصنیف وتالیف کا شغف رکھنے والے احباب کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

تذکرہ علماءِ میوات

تالیف: مولانا حامد محمود راجا۔ صفحات 112۔ طباعت: مناسب۔ ملنے کا پتا: دارالبیان لاہور 0301-4421157

جناب مولانا حامد محمود رجا کی یہ دوسری کتاب ہے جو علمائے میوات کے تذکرے پر مشتمل ہے،۔میوات کا نام آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے ان جفاکش نورانی صورتوں کے نقوش گھومنے لگتے ہیں جنہوں نے حضرت جی مولانا محمد الیاس دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولین دور میں نصرت کی۔تبلیغی جماعت کے کام کو قریہ قریہ شہر شہر پھیلایا۔اہل میوات تعلیمی لحاظ سے پسماندہ خیال کیے جاتے تھے،مگر جب تبلیغی محنت رنگ لائی تو میواتیوں میں علم دین حاصل کرنے کی خواہش بھی انگڑائیاں لینے لگی چنانچہ بہت سوں نے علم دین حاصل کیا۔یہ کتاب بنیادی طور پر میواتی حضرات کی تشجیع کے لیے لکھی گئی ہے، کہ اس قوم کے افراد اپنے بچوں کو علم دین کے حصول کی جانب راغب کریں۔کتاب میں ۲۹ معروف علماء میوات کا تذکرہ شامل ہے۔یہ اگرچہ ابتدائی کوشش ہے مگر اچھی کاوش ہے۔موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کتاب سے اعتناء برتنا چاہیے۔

سوانح حاجی عبدالوہاب مرحوم

تالیف:مفتی محمد وقاص رفیع۔صفحات 264۔طباعت:مناسب۔ملنے کا پتا:ادارۃ التحقیق والادب واہ کینٹ ضلع راولپنڈی03005808678

حضرت حاجی عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ اکابر تبلیغ میں سے تھے۔ان کی تبلیغی خدمات غیر معمولی تھیں۔حضرت جی مولانا الیاس دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اول روز جو عہد و پیمان باندھا زندگی کی آخری سانس تک اسے نبھایا۔ حضرت حاجی عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کی حیات وخدمات پر متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، انہی میں سے ایک یہ بھی ہے ترتیب و تدوین عمدہ ہے۔حضرت حاجی عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کے داعیانہ کردار، مجاہدانہ صفات،زہد وتقویٰ کا نہایت حسین عکس سامنے آجاتا ہے۔